یاران یورپ

از

اسداللہ غالب

یورپ بھر میں پھیلے ہوئے محبّ وطن پاکستانیوں کے پر جوش
جذبوں کی محبت بھری عکاسی

دیارِ غیر میں گولڈن جوبلی

عنوان بالا سے قارئین ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ میں گولڈن جوبلی اپنے وطن میں اہل وطن کے ساتھ منانے کی سعادت سے محروم رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اس ساعت سعید کے گرانقدر لمحے اس دھرتی پر موجود تھا جو گزشتہ پچاس سال سے میرے لئے پناہ ہے اور آنے والی صدیوں میں آنے والی نسلوں کے لئے پناہ بنی رہے گی۔ اب میں جس گولڈن جوبلی کا ذکر کر رہا ہوں، یہ دیارِ غیر میں پاکستانیوں کی ہے جنہوں نے اپنے پروگرام اس طرح بنائے کہ پاکستان والے چودہ اگست کی خوشیاں اپنے گھروں میں منائیں اور پھر وہ پاکستان سے باہر مقیم بھائیوں کی ان خوشیوں میں بھی شرکت کے لئے جاسکیں۔ سو اس وقت پاکستان سے ادیب، شاعر، خطیب مختلف سفارت خانوں کے ویزوں کے لئے اسلام آباد کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ مجھے بھی یہ سفر اختیار کرنا پڑا۔ اسلام آباد میں ہر شخص ڈرا رہا تھا کہ ویزوں کی بڑی سختی ہے۔ افتخار گیلانی کو معذرت کر دی گئی۔ سید فخر امام منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ ایک بڑے صنعتکار میاں حبیب اللہ جو ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں، اپنی ''اوقات'' ثابت نہ کر سکے۔ یہ کہانیاں سن کر میں شرمندہ سا ہو گیا کہ میرے پاس کوئی باقاعدہ دعوت نامہ نہیں تھا۔ اصلی ''غالب'' کی طرح میرے توشے میں کوئی بینک بیلنس شیٹ بھی نہ تھی۔ ویزہ افسر کے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا لیکن اس کے باوجود مجھ پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی نہ میں نے ہار مانی۔ بس صبح آٹھ بجے برطانوی ہائی کمیشن میں برادرم صادق لودھی صاحب کو ایک فون کر دیا۔ کہنے لگے کہ گیارہ بجے سے پہلے پہنچ جایئے۔ اس کے بعد ویزہ درخواست قبول نہیں کی جاتی۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے میں ان کے دفتر میں تھا۔ پہلے تو ان سے ویزہ فارم مانگا تو لودھی صاحب زیرلب مسکرا دیئے۔ ویزہ فارم آیا تو میں جلدی جلدی پر کرنے لگ گیا۔ اتنی دیر میں ایک گورے صاحب اندر آئے، لودھی صاحب ان کو بتا رہے تھے کہ میں ویزہ لینے آیا ہوں۔ میں فارم پر کرنے میں منہمک رہا۔ جب محسوس ہوا کہ میرے ویزے کی سفارش انہی گورے صاحب نے کرنی ہے تو جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے ہیلو کہہ کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ جواب میں انہوں نے بھی اپنا کارڈ مجھے عنایت کیا۔ کارڈ سے معلوم ہوا کہ جناب والا ہائی کمیشن میں فرسٹ سیکرٹری کے عہدے پر مامور ہیں۔ میں فارم

بھر چکا تو لودھی صاحب نے ایک سفارشی چٹھی اس کے ساتھ لگا دی۔ اس چٹھی پر فرسٹ سیکرٹری صاحب نے بھی اضافی دستخط کر دیئے۔ لودھی صاحب نے ایک سمارٹ نوجوان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مجھے ویزہ آفس چھوڑ آئے۔ میرے گلے میں ''ملاقاتی'' کا شناختی کارڈ ایک باریک سی زنجیر کے ساتھ پہنا دیا گیا۔ ہائی کمیشن کی عمارت کی بھول بھلیوں میں کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں کبھی بائیں کبھی تہہ خانے میں چلتے ہوئے میں نے اپنے گائیڈ سے کہا کہ واپسی پر میں راستہ کیسے تلاش کروں گا۔ نوجوان ہنس دیا۔ اب آپ ادھر سے واپس نہیں آئیں گے، ویزہ آفس کا دروازہ براہ راست ''باہر'' کی طرف کھلتا ہے۔ بہرحال وہ کھڑکی تک پہنچا آئے جہاں سے مجھے جواب ملا کہ یہ آپ کا نمبر ہے، اب آپ اوپر انٹرویو کے لئے چلے جایئے۔

اوپر پہنچا تو کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرا نمبر 75 تھا۔ اس وقت 68 نمبر کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ جان میں جان آئی کہ جلدی ''خلاصی'' ہو جائے گی۔ میری باری آئی اور کھڑکی نمبر 5 پر طلبی ہوئی۔ دو نوجوان سامنے بیٹھے تھے۔ ایک گورا، دوسرا پاکستانی۔ پاکستانی نے پوچھا کہ لندن کیوں جا رہے ہو۔ میں نے کہا وہاں کے پاکستانی ہماری آزادی کی گولڈن جوبلی کی تقریبات منا رہے ہیں۔ وہاں سے فون آیا تھا کہ آپ بھی آ جائیں۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا۔ دوسرا سوال تھا، کتنے عرصے کا ویزہ چاہئے۔ میرے پاسپورٹ کی میعاد صرف دو سال کی تھی۔ میں نے کہا کہ دو سال کا ملٹی پل لگا دیجئے تاکہ بار بار آپ کو زحمت نہ دینی پڑے۔ کھڑکی کے دوسری طرف دونوں نوجوانوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور پھر ایک سرخ کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں لکھا تھا کہ ویزے کی رقم کیشیئر کے پاس جمع کرا دیجئے اور پاسپورٹ پچھلے پہر آ کر لے لیجئے۔ بس ویزے کی کہانی ختم۔ باہر لوگوں نے جو ڈرا دیا تھا، وہ تو سب غلط نکلا۔ باقی لوگوں کو بھی ویزے دیئے جا رہے تھے۔ شاید ہی اس دن کسی شخص کو ویزے سے انکار کیا گیا ہو بلکہ ویزے اس قدر لگائے گئے کہ پاسپورٹوں کے ڈھیر سے میرا پاسپورٹ تلاش کرنے میں پانچ بج گئے۔ اس کے باوجود ایک انگریزی اخبار کا اداریہ پڑھنے کو ملا اور برادرم عبدالقادر حسن کا کالم بھی کہ انگریز سرکار نے ویزہ دینے کی سختی کر دی ہے لیکن مجھے اس سختی کا تجربہ نہ ہو سکا۔ یورپ کے دیگر ملکوں کے پاکستانیوں کی بھی خواہش تھی کہ اگر برطانیہ آؤں تو یورپی ملکوں کا ویزہ بھی لگوا تا آؤں تاکہ گولڈن جوبلی کی تقریبات میں شرکت کے لئے ان کے ہاں بھی جا سکوں۔ ان ملکوں کا ویزہ لینے کے لئے ایک کنفرم ٹکٹ، بینک بیلنس کی شہادت، دعوت نامہ، ہوٹلوں کی بکنگ اور معلوم نہیں کیا طومار درکار ہوتا ہے۔ بلجیم کے سفارت خانے میں ایک دوست سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا، میں یہاں بالکل نیا ہوں۔ فرانس کے سفارت خانے کے پریس سیکشن میں عقیل صاحب کو فون کیا۔ کہنے لگا بہت مصروف ہوں۔ ایک معین وقت پر پریس سمری

صاحب کی میز پر رکھنا پڑتی ہے۔ 12 بجے کے بعد آ کر شاید ایک دو منٹ آپ سے مل سکوں۔ چانس لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ 12 بجے کے بعد ان کے پاس پہنچے۔ پہلے تو فارم منگوانے کی فرمائش کی۔ اس کو جلدی سے پر کیا۔ پھر انہوں نے پاسپورٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس میں پہلے بھی تین مرتبہ یورپی ملکوں کا ویزہ لگ چکا تھا اور ایک ویزے پر صرف ایک روز کے لئے پیرس قیام کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ بہرحال عقیل صاحب پاسپورٹ اور ویزہ فارم لئے ویزہ سیکشن میں چلے گئے۔ دس منٹ بعد واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک رسید تھی اور چہرے پر امید کی کرن۔ کہنے لگے ہمارے ہاں پاسپورٹ دوسرے دن واپس ملتا ہے۔ اس لئے کل پچھلے پہر آ جایئے۔ کام ہو جائے گا اور اگلے دن پاسپورٹ واپس ملا تو اس پر چھ ماہ کا ملٹی پل ویزہ لگا ہوا تھا۔ یہ تو سب کچھ الٹ ہو رہا تھا۔ لوگوں کا تاثر کچھ اور تھا اور میرا ذاتی تجربہ بالکل مختلف۔ اب میں برطانیہ کے لئے عازم سفر ہو رہا ہوں۔

گلاسگو میں پاک سکاٹش ایسوسی ایشن گولڈن جوبلی کی تقریبات کا انعقاد کر رہی ہے جس میں شرکت کے لئے قتیل شفائی اور جمیل الدین عالی بھی پاکستان سے جا رہے ہیں۔

شبہ ہے کہ ''سفیر محترم'' عطاء الحق قاسمی ناروے سے آئیں گے۔ اس شہر میں شوکت بٹ جیسا زندہ دل شخص موجود ہے۔ بشیر مان بھی وہیں ہیں جنہیں برطانیہ میں پہلے ایشیائی کونسلر منتخب ہونے کا اعزاز ملا۔ اور چودھری محمد سرور بھی یہاں ہیں جنہیں پہلے مسلمان پاکستانی ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان دنوں وہ ابتلاء میں ہیں اور پاکستانی بھائی ان کی ٹانگ کھینچنے میں پیش پیش ہیں۔

سکاٹ لینڈ کا حُسن بڑا دلفریب ہے اور اس کے پہاڑوں اور جھیلوں میں ایک سحر ہے، اس کے قصّے مُجھ پر اُدھار ہیں۔

ریڈیو آزادی پر گفتگو

برٹش مڈلینڈ کے بوئنگ طیارے نے 50 منٹ کی پرواز کے بعد بلندی کم کرنا شروع کی تو اسے بادلوں کی کثیف تہہ کو چیرنے میں اگلے پندرہ منٹ لگ گئے۔ نیچے سبزے کی چادر میں لپٹا ہوا تاحدِ نظر گلاسگو کا شہر تھا۔ میں دو مرتبہ پہلے بھی اس شہر میں آ چکا ہوں لیکن اس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ اب یوں لگ رہا تھا جیسے سکاٹ لینڈ کے پہاڑوں نے جہاں جہاں زمین خالی چھوڑ دی تھی وہاں تک گلاسگو پھیل گیا تھا۔ ہوائی اڈے سے باہر نکلنے

میں تین چار منٹ لگ گئے۔ شوکت بٹ نے مسکراتے دمکتے چہرے کے ساتھ دور سے ہاتھ ہلا کر میرا استقبال کیا۔ اس کے ہمراہ گلاسگو کے معززین میں سے اشرف انجم، شیخ سرفراز احمد، طاہر بیگ، ٹیپو بیگ اور افضل جگر سراپا انتظار بنے کھڑے تھے۔ یہ سب دوست پاکستان سکاٹش ایسوسی ایشن کے روح رواں ہیں۔ شوکت بٹ نے مجھے اپنے گھر پہنچایا لیکن ابھی دم ہی نہ لینے پائے تھے کہ ریڈیو آزادی سے عمران کھنڈ کا فون آ گیا۔ ان کی خواہش تھی کہ مقامی پاکستانیوں کے لئے ریڈیو پر کوئی تقریر کروں۔ میں نے کہا تقریر چھوڑیئے، پاکستانیوں سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک چھوٹی سی عمارت میں عمران کھنڈ اور اس کے دوستوں نے پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک ماہ کے لئے ریڈیو آزادی کی نشریات کا اہتمام کر رکھا ہے۔ قومی ترانے، تاریخ کے واقعات اور پاکستانی بچے وقفے وقفے سے وطن کو سلام کرتے ہیں۔

ریڈیو پر یہ میری زندگی کا دوسرا پروگرام تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ریڈیو پاکستان لاہور سے یونیورسٹی ادبی پروگرام ''منشورہ'' پیش کرنے کا موقع ملا کرتا تھا۔ لیکن گلاسگو میں مجھے ''لائیو'' نشر کیا گیا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ میرے سامنے حساس مائیک نصب تھے۔ میرے کانوں پر ائرفون چڑھا دیئے گئے۔ گفتگو کے دوران دوسرے کمرے سے عمران کھنڈ اور اشرف انجم مجھ سے سوالات کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ٹیلی فون پر گلاسگو کے سامعین بھی مجھے ٹوک کر کوئی وضاحت لے سکتے تھے۔ پروگرام کوئی دس پندرہ منٹ کا تھا، لیکن آدھ گھنٹہ بعد عمران کھنڈ نے سامعین سے اجازت چاہی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی ٹیلی فون لائنیں جام ہو گئی تھیں۔ سامعین کے اصرار پر یہ پروگرام مزید آدھ گھنٹہ جاری رہا۔

میں نے آغاز میں گلاسگو کے سامعین کو 50 ویں سالگرہ پر مبارکباد دی۔ میں نے گلاسگو کے پاکستانیوں کو سلام کیا کہ انہوں نے گولڈن جوبلی کے موقع پر چودھری محمد سرور کو برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر چن کر اہل وطن کو ایک قابل فخر تحفہ پیش کیا ہے۔ میں نے کہا آزادی ایک نعمت ہے اور اس کا احساس وطن سے دور آ کر شدید تر ہو جاتا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ پاکستان کی روشن اور اجلی اجلی تصویر پیش کروں۔ سالگرہ کا دن خوشی سے معمور ہونا چاہئے۔ رونے دھونے کے لئے باقی سارا سال پڑا ہوتا ہے۔ عمران کھنڈ نے پوچھا پاکستان میں صحافت ذمہ دارانہ کردار ادا کیوں نہیں کرتی؟ میں نے کہا پاکستانی صحافت 50 سال میں پہلی بار بے باک اور آزاد ہے۔ اس کے اوپر کوئی جبر نہیں اور پاکستانی صحافی کسی دباؤ کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔

ٹیلی فون پر ایک خاتون نے انگریزی لہجے میں اردو زبان میں سوال داغا، پاکستان کے اخبارات سنسنی خیزی سے کیوں کام لیتے ہیں۔ آپ کی شہ سرخیوں کا موضوع قتل و غارت اور جرائم کے بھیانک واقعات کیوں ہیں؟

میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ اخبار وہی کچھ اچھالے گا اور چھاپے گا جو معاشرے میں ہو رہا ہو، اس پر یکے بعد دیگرے کئی سوالوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ کیا پاکستانی صحافت کو قتل و غارت کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہیں ملتا؟ میں نے کہا کہ آپ سب لوگ دراصل آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر گھبرا رہے ہیں لیکن اس میں آئینے کا قصور کیا ہے۔ آیئے ہم سب اپنے چہروں کے داغ دھبے دور کرنے کی کوشش کریں۔ ایک صاحب نے اصرار کیا کہ حضرت پاکستانی اخبارات منفی رخ دکھانے میں دلچسپی لیتے ہیں اور اگر کوئی مثبت اور حوصلہ افزاء خبر ہو تو اس کو اندر کے صفحات میں جگہ دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا تاثر سو فیصد درست نہیں۔ جس روز پاکستان اور عالم اسلام کے ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے عبدالقادر حسن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستانی میزائل پانچ منٹ بلکہ اس سے بھی کم وقت میں بھارت کے شہروں کو تہس نہس کر سکتے ہیں تو روزنامہ ''جنگ'' نے اس کی شہ سرخی لگائی اور یقین جانئے اس روز کے بعد لوگوں کو پرتھوی میزائلوں کا خوف نہیں رہا۔

سوالوں کا سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ پاکستان میں کرپشن کیوں ہے؟ لوٹ کھسوٹ کا یہ سلسلہ ختم کیوں نہیں ہوسکتا؟ احتساب کس کا اور کیسے ہو رہا ہے؟ احتساب کرنے والوں کا احتساب کون کرے گا؟ ملک کی دونوں بڑی پارٹیاں ایک دوسرے کو کرپٹ قرار دیتی ہیں تو صاف ستھری قیادت کیسے میسر آئے گی؟ کئی سوال کرنے والے پاک بھارت مذاکرات کے بارے میں شبہات اور خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ مسئلہ کشمیر کو حل کئے بغیر بھارت سے تجارت اور دوستی کیسے ہوسکتی ہے؟ میں نے کہا کہ جب تک آپکا اور دیگر پاکستانیوں کا شعور اور ضمیر زندہ ہے، کشمیر پر کوئی سودے بازی نہیں ہوسکتی اور دفاع وطن کے سلسلے میں کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں ہوگا۔ اب سوالوں کا رخ بھارت کی ٹی وی نشریات کی طرف مڑ گیا۔ فون پر ایک صاحب نے جرح کی کہ بھارت کو حملہ کرنے کی ضرورت کیا ہے، وہ تو کلچر کے محاذ پر ہمیں مات دے چکا ہے۔ اس کے سیٹلائٹ سٹیشن ہماری زبان کو بدل چکے ہیں اور نئی نسل کے ہیرو وہی ہیں جو بھارت کے ہیرو ہیں۔

میں نے کہا کہ پریشان نہ ہوئیے پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے، ہماری نئی نسل بھارت کے ٹی وی پروگراموں میں بابری مسجد کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ کلکتہ کے سٹیڈیم کو جب بھارتی تماشائیوں نے آگ لگا دی تھی، تو یہ منظر بھی ہماری نئی نسل کے دماغوں میں ایک سوالیہ نشان بن کر کھب گیا اور اگر کسی کو بھارت کی جمہوریت پر ناز تھا تو دیوگوڑا کے خلاف قرارداد عدم اعتماد کی لائیو نشریات اور اب لالو پرشاد اور ربڑی بیگم کے قصوں نے بھارتی جمہوریت کا چہرہ بھی ننگا کر دیا ہے۔

عمران کھنڈ نے کہا کہ سننے والوں کو آخر میں کوئی پیغام دیجئے۔ میں نے کہا: ''وطن آپ کا انتظار کر رہا

ہے۔ آیئے، ہم سب مل کر اس کی مدد کریں اور پاکستان کو مضبوط، مستحکم اور عظیم تر بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کریں''۔

گلوبل مسائل اور گلوبل سوچ

برطانیہ میں پاکستانیوں کو لاتعداد مسائل کا سامنا ہے لیکن مقبول رسول کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں آباد پاکستانیوں کے مسائل کم وبیش وہی ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ یہ دراصل بقاء کی جنگ ہے، مسلمان اس جنگ میں ہمیشہ سرخرو رہے اور اب بھی اگر مقامی سطح تک محدود رہنے کی بجائے ان مسائل کو گلوبل تناظر میں دیکھا جائے اور ان کا حل بھی گلوبل سطح پر تلاش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پسماندگی ہمارا مقدر بنی رہے۔

برطانوی پاکستانیوں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو سب سے بڑا چیلنج میڈیا کے شعبے میں درپیش ہے۔ مسلمانوں نے بدقسمتی سے اس طرف توجہ نہیں دی اور یہ میدان عالمی سطح پر ایسے افراد کے ہاتھ میں ہے جن کے نزدیک مسلمانوں کے کوئی بنیادی انسانی حقوق ہیں، نہ مسلم معاشرت اور تہذیب کی حفاظت اور اس کی عکاسی ان کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ امریکی اور یورپی پریس' سی این این اور بی بی سی جس طرح چاہیں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کردیں، پوری دنیا ان پر یقین کرتی ہے اور ان کے کہے پر ایمان لاتی ہے۔ مسلمانوں کا اگر کوئی نقطہ نظر ہے تو وہ سامنے نہیں آسکتا، اس لئے کہ گلوبل سطح پر اس موقف کو پیش کرنے کے لئے کوئی ذریعہ میسّر نہیں۔ برطانیہ میں جہاں لاکھوں پاکستانی آباد ہیں، اگر ان کی بات ہی کی جائے تو ان کے پاس ''جنگ'' کی شکل میں اپنا ایک اخبار موجود ہے۔ جس کے صفحات میں اہم خبریں موجود ہوتی ہیں اور برطانوی پاکستانیوں کی سرگرمیوں کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔ لیکن ریڈیو اور ٹی وی کے شعبہ میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ زی ٹی وی یہاں بھی پہنچ چکا ہے اور اس کے ڈرامے اور فلمیں ہندو کلچر اور مذہب کو نمایاں کرتی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے قصے، فلمی دنیا کے ہیرو اور ہیروئن ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں پر حاوی ہیں اور زی ٹی وی کی ہندی آمیزش والی زبان عام ہورہی ہے۔ ہمارے بچے اپنا زیادہ وقت برطانوی سکولوں میں گذارتے ہیں۔ گھر آکر تھوڑی دیر کے لئے کھانے پر اپنے والدین کے ساتھ اکٹھے بیٹھتے ہیں، پھر

ٹی وی ان کے سامنے ہوتا ہے جس میں دنیا جہاں کے چینل چل رہے ہوتے ہیں۔ بچوں پر کیا موقوف، بڑوں کے لئے بھی معلومات اور تفریح کا ذریعہ یہی ہے۔ مقبول رسول کو اس مسئلے کی سنگینی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ بڑی سنجیدگی سے اس تجویز کو پروان چڑھانے کے لئے سوچ بچار کر رہے ہیں کہ کیوں نہ گلوبل ریڈیو، گلوبل ٹی وی، گلوبل میڈیا کے نام سے مسلم دنیا کو عالمی معیار کے ذرائع ابلاغ دیئے جائیں۔ مقبول رسول کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے ''مسلم'' یا ''پاکستانی'' کا نام استعمال کیا تو ہمارے مخالفین کے کان فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کاروباری مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے ناموں کے ساتھ میدان میں اتریں جو سب کے لئے قابل قبول ہوں، پھر ان اداروں سے معیاری تفریح دی جائے تا کہ مسلمان ناظرین اس میں کشش محسوس کر سکیں۔ تفریح کے ساتھ ساتھ خبروں، فیچر پروگراموں اور دستاویزی فلموں کے ذریعے مثبت طریقے سے مسلم دنیا کا نقطہ نظر بھی پیش کیا جائے اور مخالفین کے غلط پروپیگنڈے کا مسکت جواب دیا جا سکے۔

میرے خیال میں پاکستانی اور مسلم دنیا کے ماہرین ابلاغ کو مقبول رسول کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے۔ اگر یہ نوجوان اپنی سوچ کو بروئے کار لا کر گلوبل نیٹ ورک قائم کر دیتا ہے تو مسلم دنیا کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے ماہرین کا فرض ہے کہ وہ اس نیٹ ورک کو کاروباری طور پر کامیاب بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔

مقبول رسول دیکھنے کو بے حد سنجیدہ ہے۔ کاروباری دنیا میں شاید اس کی کامیابی کا راز اس کی سنجیدگی میں پوشیدہ ہے لیکن وہ خشک انسان ہے نہ کروڑ پتیوں کی طرح مردم بیزار شخص ہے۔ وہ گلاسگو میں ہماری ہر تقریب میں موجود رہا۔ اس نے خود بھی اپنے گھر پر اور بڑے سے بڑے ہوٹل میں استقبالیہ تقاریب کا اہتمام کیا۔ مجھے اور قتیل شفائی کو لے کر وہ '' لاک لومنڈ'' بھی گیا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ سرفراز احمد اور افضل جگر بھی تھے، گلاسگو سے آدھ گھنٹہ کی ڈرائیو پر سکاٹ لینڈ کے اونچے پہاڑوں کے درمیان '' لاک لومنڈ'' کی جھیل ایک رنگا رنگ تفریحی مقام ہے۔ چند روز بعد مقبول رسول، اشرف انجم اور سرفراز احمد مجھے لے کر ائیر (AYR) کے قصبے میں لے گئے۔ یہ قصبہ سکاٹ لینڈ کے قومی شاعر رابرٹ برنز کی جائے پیدائش ہے اور دنیا بھر کے سیاح رابرٹ برنز میوزیم دیکھنے کے لئے اس قصبے کا رخ کرتے ہیں۔

مقبول رسول کو پاکستان میں کرپشن، بدعنوانی، اقربا پروری اور میرٹ کی خلاف ورزی پر بے حد

تشویش ہے۔جس روز محترمہ بے نظیر بھٹو کے اکاؤنٹوں کی بندش کی خبر آئی، ہم لوگ محمد سرور ایم پی کے گھر پر جمع تھے۔ ملک غلام ربانی، سرفراز احمد، افضل جگر، اشرف انجم، غلام محی الدین چودھری اور چودھری منظور احمد بھی وہاں موجود تھے۔ مقبول رسول وہاں تاخیر سے آئے۔ انہیں پہلے کسی مہمان کو کھانے پر لے جانا تھا۔ بہرحال جب وہ ہمارے پاس پہنچے تو السلام علیکم کی بجائے انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے سوئس اکاؤنٹ منجمد ہونے کی خبر سنائی۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے تبصرہ کیا لیکن مقبول رسول کا کہنا تھا کہ اگر حکومت پاکستان نے سوئس حکومت کو اس امر کے ثبوت فراہم نہ کئے کہ ان کھاتوں میں جمع شدہ رقوم پاکستانی قوم کی لوٹی ہوئی دولت ہے تو پھر یہ واضح ہے کہ آج کی خبر کا مقصد محض مخالفین کو رسوا کرنا ہے۔

محمد سرور کے گھر پر اس اجلاس کا مقصد برطانیہ میں پاکستانیوں کا ایک نمایندہ اور مؤثر پلیٹ فارم تشکیل دینا تھا۔ محمد سرور کا خیال تھا کہ اگر برطانیہ کے ہر ریجن میں دس پندرہ افراد کی ایک مشاورتی کونسل تشکیل دیدی جائے اور ان کی سوچ بچار کو مجتمع کر دیا جائے تو کمیونٹی کے بیشتر مسائل کا حل سوچا جا سکتا ہے۔ محمد سرور ایم پی بھی ان دنوں برطانیہ میں پاکستانیوں کے ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔۔لندن میں مخالفین کا ریڈیو بہت کامیاب جا رہا ہے۔ اس کی کامیابی کے پیچھے پاکستانیوں کی اشتہار بازی کی قوت کارفرما ہے۔ اور مسلمان اگر یہ اشتہارات اپنے چینل کو دے دیں تو یہ پہلے دن سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ محمد سرور ایم پی کی خواہش ہے کہ برٹش میڈیا کارپوریشن ''بی ایم سی'' کو رجسٹرڈ کرایا جائے اور اس کے زیر اہتمام برطانیہ میں ریڈیو اور ٹی وی نیٹ ورک قائم کیا جائے۔ محمد سرور کو امید ہے کہ اگر وہ اس راستے پر چلے گا تو اس کا ساتھ دینے کے لئے کئی درد مند آگے بڑھیں گے۔ میں نے محمد سرور ایم پی اور مقبول رسول سے درخواست کی کہ اگر وہ دونوں ایک ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیں تو شاید انہیں کسی دوسرے سہارے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

پاکستان کی حقیقی گولڈن جوبلی

میری آنکھیں دھوکا کھا رہی تھیں، مجھے اپنی قوت سماعت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اشرف انجم نے سب سے پہلے مجھے گلاسگو میں ریڈیو آزادی پر پاکستانی بھائیوں سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کیا تھا۔ میں اپنے گزشتہ کالموں میں گلاسگو کے پاکستانیوں کے جذبات کی عکاسی کر چکا ہوں لیکن مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ

وطن سے دور رہنے والے پاکستانی اپنے وطن سے کس طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

اشرف انجم نے مجھے دوسری دفعہ اس وقت حیرت زدہ کر دیا جب آئر لینڈ کے سمندری ساحل پر واقع ''ائیر'' میں وہ سکاٹش شاعر رابرٹ برنز کی رہائش گاہ دکھانے لے گیا۔ سکاٹ لینڈ میں رابرٹ برنز کو قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے اور بشیر مان ہر سال ''اقبال برنز نائٹ'' میں دو قوموں کے عظیم شاعروں کو خراج تحسین پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ میں بہت دیر تک جواں مرگ برنز کی '' کٹیا'' یعنی کاٹیج کے دروازے پر کھڑا رہا۔ اشرف انجم نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا'' شاعر صاحب ! میں آپ کو اس قصبے سے ذرا آگے ایک ایسی ڈھلوان پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں انسان'' بصری واہمہ'' کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈھلوان سڑک کے اس حصے پر گاڑی کو نیوٹرل کر دیں تو گاڑی آگے کو لڑھکنے کی بجائے رک جاتی ہے اور اگر اس سڑک پر واپس آئیں اور چڑھائی چڑھتے ہوئے گاڑی کے انجن کو نیوٹرل کر دیں، تو گاڑی پھر بھی اوپر کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہماری طرح ہر گاڑی والا اس تجربے سے گذر رہا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا معاملہ ہے، بس ہر شخص حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

اشرف انجم نے اصرار کیا کہ میں مزید چند دن گلاسگو میں رکوں اور نواحی علاقے رین فریو میں پاکستان ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام گولڈن جوبلی کی تقریب میں شرکت کروں۔ بظاہر میرے لئے اس تقریب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن میں نے اپنے قیام گلاسگو میں توسیع کی حامی بھر لی۔

اگست کا آخری دن ایک المناک خبر کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ لیڈی ڈیانا کی ناگہانی موت پر پورا انگلستان سوگوار تھا۔ ہر سو صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ زندگی کا پہیہ رک سا گیا تھا۔ تمام معمولات ختم کر دئے گئے تھے۔ اور ہر قسم کی رسمی تقریب کے التوا کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شام کو ہونے والی اشرف انجم کی گولڈن جوبلی تقریب بھی ختم ہو جائے گی لیکن پتہ چلا کہ تقریب اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو گی۔

دوپہر تک ملک غلام ربانی نے اس امر کی تصدیق کر دی کہ مہمان خصوصی ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع بھی لندن سے آ گئے ہیں۔ شام کو رین فریو کونسل کے ہال میں پہنچے۔ بڑے سلیقے سے گول میزیں لگی ہوئی تھیں اور شہر کے دو سو شرفاء ہمہ تن گوش تھے۔ مہمان خصوصی کی لمبی میز پر درمیان میں پاکستانی ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع ، ان کے ایک طرف تقریب کے روح رواں اشرف انجم اور دوسری طرف کونسل کے سربراہ ایلن سٹیل، دائیں بائیں چودھری محمد سرور ایم پی، جے پی مقبول رسول، اسلم شیخ، عبدالغفور اور سکاٹش کمیٹی کے چند سرکردہ

افراد بیٹھے تھے۔تقریب کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ پھر کونسل کے سربراہ ایلن سٹیل مائیک پر آئے۔ چند فقرے ڈیانا کی وفات پر اور پھر دو منٹ پورا مجمع خاموش رہا۔ان رسوم سے فارغ ہوکر جناب ایلن سٹیل نے اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھنا شروع کی۔یہیں سے میرے لیے حیرت کا ایک نیا باب کھلا۔ کونسل کے سربراہ نے کہا کہ پاکستان کا خواب ایک شاعر علامہ اقبال نے دیکھا، وہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ پھر قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت سنبھالی اور اقبال کے خواب کو عملی تعبیر دینے کے لئے قرارداد منظور کی جسے ''انڈین پریس '' نے قرارداد پاکستان کا نام دیا۔کونسل کے سربراہ نے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا کہ لفظ پاکستان چودھری رحمت علی کا تجویز کردہ ہے جو انگلستان کی خاک میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ جناب ایلن سٹیل نے قائد اعظم کو اس بات پر خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور دیگر قوموں کے لئے مساوی حقوق کا اعلان کیا تھا۔ ایلن سٹیل نے یہ حقیقت بھی یاد دلائی کہ پاکستان کے قیام کی راہ میں مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر قائد اعظم کے مطالبات کو پذیرائی بخشی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دیا۔ایلن سٹیل نے کہا جو حق لیبر حکومت نے ۵۰ قبل برصغیر کے مسلمانوں کو دیا تھا وہ ٹھیک پچاس سال بعد سکاٹ لینڈ کے باشندوں کو مل رہا ہے اور ۱۱ ستمبر کے ریفرنڈم میں وہ اپنا حق خود اختیاری استعمال کرتے ہوئے سکاٹش پارلیمنٹ کی تشکیل کے لئے ووٹ دیں گے اور امید ہے کہ وہ ایک صائب فیصلہ کریں گے۔ایلن سٹیل نے اس دکھ کا بھی اظہار کیا کہ برصغیر میں مسئلہ کشمیر ابھی تک حل نہیں ہوا۔ان کا کہنا تھا کہ کشمیری باشندوں کو بھی اپنا حق خود ارادیت ملنا چاہئے۔

خطبہ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے اشرف انجم نے قیام پاکستان کے محرکات پر روشنی ڈالی اور کشمیر کے مسئلے کو برٹش راج کا شاخسانہ قرار دیا۔ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے برطانوی حکومت پر دباؤ بڑھانا چاہیے۔اس مسئلے کا حل ان پر قرض ہے۔ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع نے کہا کہ مسئلہ کشمیر پوری انسانیت کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ پچاس سال میں یہ مسئلہ سنگین اور پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔اس کے حل کے لئے پاک بھارت مذاکرات کا سلسلہ چل پڑا ہے لیکن ہم لوگوں کو مزید صبر کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔۵۰ سال کا جھگڑا ۵۰ دنوں میں طے ہونا مشکل ہے۔کونسل کے کنوینر مسٹر ٹیلر نے شہریوں کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستانی کمیونٹی کو پچاسویں یوم آزادی کی مبارکباد پیش کی۔ مسئلہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ ہماری کونسل ستمبر ۱۹۴۸ء کی اقوام متحدہ کی قرارداد کی تائید کرتی ہے اور اس کی روشنی میں

کشمیریوں کے مصائب کا خاتمہ چاہتی ہے۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میری قوت سماعت مجھے دھوکہ دے رہی تھی۔ پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی سکاٹ لینڈ کی ایک چھوٹی سی کونسل کے زیر اہتمام مناتے ہوئے میں حیرتوں میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ کاش ! میں نے یہ مناظر ۱۴ اگست کو اسلام آباد، لاہور، کراچی یا کوئٹہ یا پشاور میں دیکھے ہوتے۔ کاش ! میں نے یہ سب کچھ پاکستانی قائدین کے منہ سے سنا ہوتا۔ اشرف انجم کا شکریہ کہ اس نے وطن سے دور اغیار کے منہ سے یہ سب کچھ سننے کا موقع تو فراہم کر دیا۔

پیپلز پارٹی کی سرفرازی درجات کا نسخہ

ملک کی اپوزیشن سرگرم اور متحرک نہ ہو تو وہ کارکن اور ووٹر مزید مایوسی کا شکار ہو جائے گا جس نے پارٹی قیادت کے کردار اور طرز حکومت سے متنفر ہو کر فروری ۹۷ء کے انتخابات میں گھر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو دوبارا اقتدار ملا۔ دونوں مرتبہ لولا لنگڑا مینڈیٹ تھا۔ قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں اور بہت سی شرائط اور مصلحتوں کے تحت اقتدار دیا گیا تھا۔ یہ سب عوامل اپنی جگہ پر لیکن دونوں مرتبہ پیپلز پارٹی کی حکومت اپنے منشور پر عمل کرنے کی بجائے ایسے ناپسندیدہ کاموں میں مشغول رہی جن کا دفاع ملک کے اندر تو شاید کیا جا سکتا ہو، لیکن ملک سے باہر اس مایوس کن کارکردگی کا جواز پیش کرنا مشکل ہے۔ پیپلز پارٹی سکاٹ لینڈ کے موجودہ صدر سرفراز احمد ایک جیالے اور مخلص کارکن کے طور پر نہ پارٹی کے حکومتی کردار سے مطمئن ہیں اور نہ اب اپوزیشن کے کردار سے انہیں کوئی تسلی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے ارکان پارلیمنٹ کوئی تیاری کر کے ایوان میں نہیں جاتے اور پارٹی قیادت عوام کے ساتھ رابطہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی۔ حالانکہ موجودہ حکومت ہر محاذ پر ناکام ہے۔ اسے بھاری مینڈیٹ دیا گیا اس نے کرپشن اور بدامنی کے خاتمہ، احتساب، روزگار کی فراہمی اور معاشی ترقی و خوشحالی کا نعرہ لگایا تھا لیکن اس میں سے کوئی ایک بات پوری ہوتی نظر نہیں آتی، اور کسی بھی اپوزیشن کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے کہ حکومت ہر شعبے میں ناکام ہو رہی ہو تو اپوزیشن اس کے خلاف عوام کو موبلائز کرنے میں ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کرتی لیکن پیپلز پارٹی کا یہ

حال ہے کہ جیسے ملک کی صورت حال سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ سرفراز احمد کا تعلق پیپلز پارٹی کے ان عناصر سے ہے جو بھٹو کے انقلابی فلسفے سے متاثر ہوئے۔ جنہوں نے اس فلسفے کو پاکستان میں ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کی ضمانت سمجھا۔ وہ سوچتے تھے کہ بھٹو کے خواب کی تعبیر سامنے آئے گی تو مساوات کا دور دورہ ہوگا، توازن پیدا ہوگا۔ غریب اور امیر میں فرق اور فاصلہ مٹے گا، انتظامیہ قوم کی خادم ہوگی، عدالتی نظام فوری اور سہل ہوگا۔۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ وہ غریب اور مفلس کارکن جو سختیاں برداشت کرتا رہا۔ جس نے جیلیں کاٹیں، کوڑے کھائے، جلاوطنی دیکھی، وہ آج بھی دربدر ہے۔ اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ سرفراز احمد کا کہنا ہے کہ ہم لوگ جمہوری معاشرے کا حصہ ہیں۔ مغرب میں رہ کر ہمارا ذہن اس حکمت عملی کو قبول نہیں کرتا جو پارٹی نے ملک کے اندر اختیار کر رکھی ہے۔ مغربی معاشرے میں لوگوں کو سارے حقوق حاصل ہیں۔ تعلیم، صحت اور روزگار کے موقع یکساں ہیں۔ کسی کا حق مارنا اس معاشرے میں ممکن نہیں۔ یہاں رہ کر ہماری سوچ بھی لازمی متاثر ہوئی ہے۔ ہم فیئر پلے کے عادی ہیں اور ہماری خواہش تھی کہ ملک کے اندر پیپلز پارٹی کو جب بھی حکومت کا موقع ملا تو اسے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت فراہم کرنا چاہئے تھا اور بدقسمتی سے بعض لوگ ذاتی خدمت اور ذاتی مفادات کے تحفظ میں ملوث رہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پارٹی قیادت اور کارکن کے درمیان پایا جانے والا فاصلہ آپ لوگوں کے لئے سنگین نقصان کا باعث ہوگا..... میرے اس سوال کے جواب میں سرفراز احمد نے کہا: پیپلز پارٹی کا موجودہ کردار اس قدر مایوسی پیدا کر رہا ہے کہ اگر ہم نے ہوش کے ناخن نہ لئے اور اپنی روش کو نہ بدلا اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے میں غلطی پر غلطی کرتے رہے تو بعید نہیں کہ پیپلز پارٹی کی جگہ اپوزیشن کی سیاست بھی کسی تیسری قوت کے ہاتھ میں چلی جائے۔ آپ اس قدر بے یقینی کا شکار کیوں ہیں۔ سرفراز احمد میرا سوال سنتے ہیں اور دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہیں:۔ پیپلز پارٹی سمجھتی ہے کہ اسے پاور پالیٹکس کرنی چاہئے۔ اقتدار کے اس کھیل میں صرف کرسی اصل مقصد رہ جاتا ہے اور نظریہ پس پشت چلا جاتا ہے۔ اس وقت یہی ہو رہا ہے لیکن میں پوری طرح مایوس نہیں ہوں۔ پیپلز پارٹی کا کارکن آج بھی اپنے دل کے دروازے پر دستک کا منتظر ہے۔ فروری ۹۷ء کے انتخابات میں پارٹی ووٹر کے رویہ اور بددلی کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا ووٹ بنک ختم ہو چکا ہے لیکن یہ رویہ تو

اس بات کی دلیل ہے کہ پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک پوری طرح محفوظ ہے لیکن اب اسکے ووٹ کو متحرک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پارٹی اپنے کرپٹ اور بدعنوان عناصر سے خلاصی حاصل کرے۔

اقتدار کے لالچی لیڈران کرام خود بھی پارٹی پر رحم کریں اور کسی دوسری پارٹی میں جا کر اپنے مقاصد کی تکمیل کریں، پیپلز پارٹی تو ایک نظریئے، ایک مقصد حیات، ایک فلسفے اور ایک منشور کو لے کر چلی تھی، محترمہ بے نظیر بھٹو کا فرض ہے کہ وہ پارٹی کے اس بنیادی کردار کو زندہ کریں اور ماضی کی غلطیوں سے آئندہ بچنے کا عہد کیا جائے۔ دیانتدار اور باصلاحیت لیڈر شپ کو آگے لایا جائے تاکہ آئندہ کسی کو گند اچھالنے کا بہانہ میسر نہ آئے۔ ملک کے فرسودہ نظام کو بدلنے کے لئے ایک متحرک اور مؤثر حکمت عملی تیار کی جائے۔ اقتدار ملک کے اصل وارث یعنی عوام کو منتقل کیا جائے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سکاٹ لینڈ پیپلز پارٹی کے صدر سرفراز احمد کی باتیں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہیں اور کون کون ان کے مطالبات پر اخلاص کے ساتھ کان دھرتا ہے۔۔۔۔!!!

امریکی بالادستی اور پاکستان

ملک غلام ربانی سے ملاقاتیں تو پہلے روز سے ہو رہی تھیں، کبھی کسی کھانے میں، کبھی مشاعرے، کبھی ریڈیو آزادی کے دفتر میں، کبھی پاکستانی فورم کے معاملات نبٹاتے ہوئے۔ پورا گلاسگو ملک صاحب کو ''بابائے امن'' کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک صاحب کی شہر میں پاکستانی کمیونٹی بے حد عزت کرتی ہے اور کسی بھی جھگڑے کی صورت میں ان کا حکم آخری سمجھا جاتا ہے۔

ملک غلام ربانی ابھی اتنے بابے نہیں ہوئے لیکن پاکستانی برادری نے جس پیار، خلوص اور احترام کے ساتھ انہیں بابائے امن کا خطاب دیا ہے اس پر انہیں بجا طور پر ناز ہے۔ ملک صاحب کے چہرے پر آپ ہمہ وقت ایک مسکراہٹ دیکھیں گے۔ کڑے سے کڑے وقت میں ان کی یہی مسکراہٹ ماحول کو خوشگوار بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ملک صاحب بے حد خوش تھے کہ کسی پاکستانی وزیراعظم نے وی آئی پی کلچر کو خیر باد کہتے ہوئے عام پرواز سے امریکہ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پاکستانی ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع کا ایک تعریفی بیان بھی اس ذیل میں ''جنگ'' کی سرخی بن چکا تھا لیکن جب پرواز کے اگلے روز اخبار آیا تو یہ تکلیف دہ حقیقت سامنے آئی کہ امریکہ

کی پرواز کو عین آخری وقت میں وی آئی پی ڈیکلیر کر دیا گیا تھا اور دو سو کے قریب مسافروں کو اس پرواز میں سفر کرنے سے روک دیا گیا تھا اور ان کا سامان نیچے اتارنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ ملک غلام ربانی اس پر بے حد رنجیدہ تھے۔ جس جس شخص نے یہ خبر پڑھی، وہ افسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ماضی میں اتار چڑھاؤ کا شکار رہے ہیں۔ ملک غلام ربانی نے تفصیل سے اس تاریخ کو بیان کیا۔ میں نے کہا: ''آپ مستقبل میں پاک امریکہ تعلقات کو کیسا دیکھتے ہیں''۔ ملک صاحب نے کہا دراصل اس وقت پاکستانی قیادت کو سیاسی ذمہ داریوں کا احساس دلائے۔

پاکستان امریکہ کے دباؤ میں ہے۔ بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ امریکہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنڈے کے تحت کشمیر کا مسئلہ اپنی مرضی سے حل کرنا چاہتا ہے اور اس وجہ سے لوگ تھرڈ آپشن کی بات کرتے ہیں۔ لوگوں کو شک ہے کہ امریکہ کشمیر کو ایک خود مختار ملک بنا کر اس کے معاملات کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے اور یہاں سے ایک طرف بھارت اور دوسری طرف چین کے خلاف جاسوسی نظام چلانا چاہتا ہے۔ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ امریکی عزائم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں نے پوچھا ''امریکہ نے جہاد افغانستان کے دوران ہمارا کھل کر ساتھ دیا تھا اب یکا یک اس نے نظریں کیوں پھیر لی ہیں''۔ ملک غلام ربانی نے کہا۔ ''افغانستان میں روس کو پھنسانے اور بالآخر اسے شکست سے دوچار کرنے کے لئے امریکہ کو ہماری ضرورت تھی جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو امریکہ نے ہم سے قطع تعلق کر لیا اس کی گرم جوشی ختم ہو گئی۔ اب تو وہ افغان خانہ جنگی کے خاتمے کا بھی خواہاں نہیں ہے جو کہ تقریباً پچھلے دس سال سے جاری ہے اور جس میں پہلے سے زیادہ لوگ مارے جا رہے ہیں۔ امریکہ اس لئے کابل میں سیاسی استحکام کے خلاف ہے کہ اس سے پاکستان کو افغانستان کے راستے وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان ریاستوں کو ہر چیز درکار ہے اور یہ پاکستان سے فراہم ہو سکتی ہے اور اگر کوئی چیز پاکستان میں دستیاب نہ بھی ہو تو کراچی کی بندرگاہ سے خشکی کے راستے وسط ایشیائی ریاستوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ پاکستان کو راہداری سے بھی بے اندازہ مالی منفعت حاصل ہو گی۔ امریکہ نہیں چاہتا کہ پاکستان کی معیشت مستحکم ہو۔ ملک غلام ربانی نے کہا: امریکہ ہمیں لولا لنگڑا دیکھنے کا خواہاں ہے اور پاکستان کو اپنا دست نگر دیکھنا چاہتا ہے۔ بھارت سے دوستی کے لئے بھی امریکہ ہی مجبور کر رہا ہے۔ پاک بھارت مذاکرات کے پیچھے بھی امریکہ بہادر کا ہاتھ کارفرما ہے۔ وزیراعظم پاکستان کے دورہ امریکہ کے تناظر میں بات کرتے ہوئے ملک غلام ربانی نے کہا کہ اس وقت مسئلہ سلامتی کونسل میں توسیع کا ہے۔ امریکہ اپنی مرضی سے ووٹ لینا چاہتا ہے لیکن ظاہر یہ کیا گیا کہ اس موقع پر نواز شریف کی ملاقات کلنٹن سے ہو گی اور ساتھ ہی بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال کے درشن

بھی ہوں گے۔ ان ملاقاتوں کو بے حد اہمیت دی جا رہی ہے لیکن یہ محض رسمی ملاقاتیں ہیں ان کا کوئی باقاعدہ ایجنڈا نہیں ہے اور اگر در پردہ ایجنڈا ہے بھی تو اس کا اندازہ اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان اپنے علاقے میں بھارت کی تھانیداری تسلیم کرے۔ بھارت نے یقینی طور پر امریکی پٹھو بننے پر رضا مندی کا اظہار کر دیا ہے۔ پاکستان میں اسلامی رجحانات نہ امریکہ کو پسند ہیں، نہ بھارت کو، نہ اسرائیل کو۔ ان سب کی خواہش ہے کہ پاکستان قرضوں کے جنجال میں پھنسا رہے۔ صرف اسی ایک ہتھیار سے پاکستان کو اقتصادی غلامی میں جکڑے رکھنے کی امریکی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ یہ صورت حال پاکستانی قیادت کے لئے سخت امتحان ہے اور خود پاکستانی قوم کو بھی اپنے مستقبل کی فکر ہونی چاہئے۔ ملک غلام ربانی کا خیال ہے کہ وہ برطانیہ میں آباد پاکستانیوں کی ایک لابی متحرک کرنا چاہتے ہیں۔

نو وار پیکٹ اور مسئلہ کشمیر

ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ دو دوستوں سرفراز احمد اور میر بشیر کے ساتھ سکاٹ لینڈ کی بلندیوں کی طرف سفر کر رہا تھا۔ سکاٹ لینڈ کی سرسبز پہاڑیاں، گھنے جنگل اور لمبی لمبی جھیلیں اور کہیں کہیں درمیان میں مرغزاروں کے سلسلے نجانے کب سے میرے خوابوں میں بسے ہوئے تھے۔ میں جب بھی کبھی مری جاتا ہوں تو وقت نکال کر ذرا آگے بھوربن ضرور جاتا ہوں جہاں سے کشمیر جنت نظیر کے نظارے میری روح کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ برس ہا برس سے میرے لئے کشمیر کا منظر یہی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس منظر کو قریب سے دیکھنے کا موقع میری نسل میں سے کسی کو مل سکتا ہے اور اگلی نسل کو بھی نجانے کب تک مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ سکاٹ لینڈ کے پہاڑوں میں مجھے بھوربن کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس لئے میں گلاسگو آؤں تو ان پہاڑوں میں بل کھاتی سڑکوں پر سفر کے لئے نکل جاتا ہوں۔ حالیہ سفر میں دوستوں کی رفاقت کی وجہ سے سارے راستے مسئلہ کشمیر پر گفتگو ہوتی رہی۔ میر بشیر کو گلاسگو میں آئے ایک مدت بیت چکی ہے۔ ان کا تعلق میر پور سے ہے اور کشمیر کی سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز ایوب، نہرو اور شیخ عبداللہ کے دور سے کیا۔ میر بشیر بعض اہم تاریخی واقعات میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں لیکن ان کی تفصیلات وہ تاریخ کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ میر بشیر ان کشمیریوں میں سے ہیں جو کشمیر کو الگ ریاست کے طور پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ میں نے پوچھا:

آپ کی اس رائے سے اتفاق کرنے والے آزاد کشمیر
اور مقبوضہ کشمیر میں کتنے لوگ ہیں؟ کہنے لگے:

اکثریت اس نقطہ نظر کی ہم نوا ہے۔ میں نے پوچھا اگر یہ بات ہے تو پھر سری نگر میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کس نے منائی اور کیوں منائی اور اگلے روز بھارت کی گولڈن جوبلی پر آخر ہڑتال کس نے اور کیوں کی؟ احتجاجی جلوس نکلے اور لوگوں نے لاٹھیاں کھائیں تو آخر کیوں؟ ایسا صرف اس مرتبہ نہیں ہوا بلکہ ہر سال 14 اگست پر سری نگر کے عوام پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اپنے گھروں میں لہراتے ہیں۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم بھارت کے مقابلے میں کوئی میچ جیتے تو پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔

میر بشیر نے کہا: کشمیر میں تحریکِ آزادی میں شریک لوگ اب سہاروں کی طرف نہیں دیکھتے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنے ہی زور بازو پر انحصار کرنا ہے، اپنی ہی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہے اور اپنا ہی خون بہانا ہے۔ عام کشمیری بہرحال پاکستان کو دوست تصور کرتے ہیں اور اگر کشمیر ایک خودمختار مملکت کے طور پر وجود میں آتا ہے تو اس کے زیادہ قریبی تعلقات پاکستان سے ہی قائم ہوں گے۔ کشمیری عوام کے ''پاکستان زندہ باد'' کے نعروں کا مطلب یہی ہے۔ میں نے پوچھا ''اس ریاست کا حدود اربعہ کیا ہوگا؟ کیا جموں اور لداخ بھی اس میں شامل ہوں گے اور کیا آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں کو بھی اس میں شامل کیا جائے گا''۔ انہوں نے کہا: کشمیر کی سرحدیں وہی ہوں گی جو تاریخی طور پر مُسلّم ہیں۔ میں نے کہا: دنیا میں پہلے فلسطینی مسلمان اپنی جدوجہد میں مصروف ہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں انہیں کیا ملا؟ وہ علاقے جن کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں، جن کی اپنی کوئی فوج نہیں کوئی پاسپورٹ اور ویزہ نہیں، یہ معاملات اسرائیل میں کنٹرول کئے جاتے ہیں اور اسرائیلی ویزے پر ہی اس فلسطینی ''ریاست'' میں داخلہ ممکن ہے۔ کہیں کشمیریوں کو بھی تو اس انجام سے دوچار نہیں کر دیا جائے گا۔

میر بشیر نے کہا: یہ تو خطرناک صورتحال ہے۔ کوئی کشمیری ایسی آزادی کا طلب گار نہیں اور اگر ہے تو اسے اپنی اصلاح کر لینی چاہئے۔ قدرے توقف سے میر بشیر نے مجھ سے پوچھا: لیکن پاکستان بھی تو ہمارے لئے لڑنے کو تیار نہیں، قائداعظمؒ کی زندگی میں ہمارے قائدؒ کی حکم عدولی کرتے ہوئے انگریز کمانڈر انچیف نے فوج کو حرکت دینے سے انکار کر دیا تھا، 65ء میں گوریلا جنگ کا ادھورا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ 71ء کی لڑائی تو مشرقی پاکستان کی وجہ سے شروع ہوئی۔ کشمیر کے لئے پاکستان کب سنجیدہ ہوا ہے۔

میر بشیر نے ایک حد تک مجھے لاجواب کر دیا تھا اور جب میاں نواز شریف نے اقوام متحدہ میں بھارت کو نووار پیکٹ کی پیشکش کی تھی تو میرے ذہن میں آیا کہ میر بشیر کے شبہات درست تھے۔ اگر پاکستان اور بھارت

کے مابین نو وار پیکٹ ہو جاتا ہے تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ دونوں ملک مسائل کی موجودہ پوزیشن پر مطمئن ہیں اور مستقبل میں ان مسائل کی وجہ سے وہ جنگ کا راستہ اختیار کرنے سے باز رہیں گے۔ پاکستان نے ایوب خان کے دور میں بھی بھارت کو نو وار پیکٹ کی پیشکش کی تھی، اب پھر وہی باتیں زبان پر ہیں، نہ ایوب خان کو نہرو سے کوئی مثبت جواب ملا نہ نواز شریف کو گجرال نے کوئی جواب تک بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کشمیر کی ''سرحد'' گرم ہے۔ ورکنگ باؤنڈریز پر جھڑپیں معمول بن گئی ہیں، بھارت یہاں خاردار باڑ اور سرچ لائٹیں لگانا چاہتا ہے، پاکستان یہ صورتحال گوارا نہیں کرسکتا۔ وادی نیلم میں کئی برس سے محاصرے کی کیفیت ہے اور کئی بار ایسی نوبت آئی ہے کہ مقامی آبادی کو راشن پانی پہنچانے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اب کشمیر کی بلندیوں پر جھڑپیں ہوئی ہیں۔ گجرال کا کہنا ہے قصور کسی کا ہو، فائرنگ بند ہونی چاہئے۔ یہ ایک نئی منطق ہے کہ پاکستان صرف زیادتی برداشت کرتا رہے۔ میں اس وقت وطن سے دور ہوں مجھے جو پاکستانی یا کشمیری ملتا ہے وہ پاکستان کے ممکنہ ردّعمل کے بارے میں پوچھتا ہے۔ میں پاکستان کی سیاسی قیادت کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا راستہ اختیار کرے گی، اس لئے کہ وہ بین الاقوامی مجبوریوں کے دباؤ میں ہے اور اسے اپنے ضمیر کے خلاف بھی بولنا پڑتا ہے۔

عمران خان کے شانہ بشانہ

گلاسگو کے بعد میری اگلی منزل مانچسٹر ہے۔ سکاٹ لینڈ میں دو ہفتے کے قیام کی روداد ابھی نامکمل ہے۔ درمیان میں اسکاٹش پارلیمینٹ کے قیام کیلئے ریفرنڈم بھی ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیلات جاننے کے لئے پھر گلاسگو جا پہنچا۔ پورے برطانیہ میں پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں تقریبات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس کی روداد یقینی طور پر ایمان افروز ہے۔ مانچسٹر میں پہلی ملاقات تو چودھری غلام محی الدین کے گھر پر مقامی نمائندہ افراد سے ہوئی۔ ان میں چودھری منظور، چودھری سرور، چودھری نصیر اور عطاء اللہ جتالہ شامل تھے۔ تمام احباب وطن عزیز کی صورتحال پر گہری تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ خاص طور پر امن و امان کا مسئلہ سب کیلئے پریشانی کا باعث تھا جس کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کار تذبذب کا شکار ہے۔ چودھری منظور گلہ کر رہے تھے کہ عمران خان کی سیاست اور ان کے خیراتی کاموں کو آپس میں گڈمڈ کیا جا رہا ہے ان کا کہنا تھا کہ اگر عمران خان پاکستانی سیاست میں مفید ثابت ہوسکتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ اگلے روز

چودھری منظور کے گھر پر ایک نوجوان طاہر نواز سے ملنا ہوا۔ وہ بھی عمران خان کے دست راست سمجھے جاتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے اکاؤنٹنٹ ہیں اور اس نسبت سے انہوں نے پاکستانی سیاستدانوں کی کرپشن کے ثبوت اکٹھے کرنے میں گہری دلچسپی دکھائی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سرے محل کے بارے میں وہ تمام دستاویزی ثبوت حکومت پاکستان کو گذشتہ برس کے آخر میں فراہم کر چکے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ابھی تک کوئی کارروائی عمل میں کیوں نہیں آئی۔ طاہر نواز صاحب تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ اگر پاکستانی حکام دلچسپی ظاہر کریں تو وہ تمام پاکستانی سیاستدانوں، بیوروکریٹس اور صنعتکاروں کے خفیہ سوئس اکاؤنٹس تک پہنچ سکتے ہیں۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ پاکستانی حکومت نے محترمہ بینظیر اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے ان اکاؤنٹوں کا سراغ لگا لیا ہے اور سوئس حکومت کی مدد سے یہ اکاؤنٹ منجمد کروا دیئے ہیں۔ یہ خبر کسی بھونچال سے کم نہیں اور برطانیہ میں پیپلز پارٹیکے حامی افراد کے لئے اس کا دفاع کرنا آسان نہیں ہے۔ بہرحال بات عمران خان کی سیاست اور چودھری منظور اور طاہر نواز کی ہو رہی تھی۔ مؤخرالذکر دونوں افراد کے لئے عمران خان امید کی ایک اور کرن ہے۔ پاکستان میں کرپشن، لوٹ مار، بددیانتی، رشوت خوری، قرض خوری کی جو عادت بد چل نکلی ہے اور بالا دست طبقوں نے قانون شکنی کو جس طرح شعار بنا لیا ہے، اس کے خلاف عمران خان نے بھرپور آواز بلند کی تھی اور لوگوں نے سنی ان سنی نہیں کی بلکہ کرپٹ طبقے کے خلاف نفرت کا کھل کر اظہار کیا جا رہا ہے۔ وی آئی پی کلچر کے خاتمے میں بھی عمران خان کو کامیابی ملی ہے اور گذشتہ برس ''تحریک انصاف'' کے قیام کے بعد فوری طور پر انتخابی امتحان نے عمران خان کو تجربے کی ایک نئی دولت سے ہمکنار کیا ہے۔ چودھری منظور اور طاہر نواز کے خیال میں گو عمران خان کو بہت زیادہ تیاری کا موقع نہیں ملا لیکن انتخابی اکھاڑے سے وہ صیقل ہو کر باہر نکلا ہے اور اب ایک نئے کردار کیلئے تیار ہے۔ تحریک انصاف نے پاکستان میں 5 اکتوبر کو ایک کنونشن کے انعقاد کا اعلان کیا ہے۔ عمران خان ان دنوں بے حد مصروف ہے، لیڈی ڈیانا کی آخری رسوم میں شرکت کیلئے وہ ہنگامی دورے پر لندن آیا تھا اور اسی طرح ''کھڑے پیروں'' واپس چلا گیا۔ برطانیہ میں عمران خان کے پرستار اور ہمدرد افراد بھی پاکستان میں 5 اکتوبر کے اس کنونشن میں شرکت کیلئے کمر کس رہے ہیں۔

عمران خان کے بارے میں عام طور پر جس منفی پروپیگنڈے کا اظہار کیا جاتا رہا ہے، اس موضوع پر طاہر نواز سے میری طویل بحث ہوئی۔ قدرتی طور پر عمران خان کے ایک پیروکار اور دوست ہونے کے ناطے طاہر نواز کو دفاع کرنا ہی چاہئے تھا، تاہم اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے حوالے سے جو تجربہ رکھتا ہے، اس کی رو سے بھی عمران خان کو مسٹر کلین سمجھتا ہے۔ شوکت خانم ہسپتال کا قیام جدید تاریخ کا ایک معجزہ ہے۔

پاکستان جیسے غریب ملک میں کینسر ہسپتال کا تو خواب دیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔ اردگرد کے ممالک تو کیا، ترقی یافتہ دنیا میں اس ہسپتال کا ایک مقام ہے۔ جدید ترین مشینری اور علاج معالجے کے لئے ڈاکٹروں کی ایک انتہائی تجربہ کار ٹیم کے ساتھ اس ہسپتال پر پوری پاکستانی قوم فخر کا اظہار کر سکتی ہے۔

یہ کارنامہ اکیلے عمران خان نے سرانجام نہیں دیا بلکہ وطن کے بچے بچے نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اوورسیز پاکستانیوں نے بھی دامے درمے سخنے ہر لحاظ سے شایانِ شان کردار ادا کیا ہے۔ عمران خان اور شوکت خانم کینسر ہسپتال کی راہ میں رکاوٹیں بھی بہت ڈالی گئیں۔ لیکن عمران خان اور اس کے پرستاروں نے ہمت نہیں ہاری۔

برطانیہ میں پاکستانیوں کا نیا کردار

مانچسٹر کسی زمانے میں ٹیکسٹائل کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا لیکن اب یہاں کے ''چودھری'' اس شہر کی پہچان ہیں۔ چودھریوں کی کمی تو گلاسگو میں بھی نہیں اور ان کے درمیان میر بشیر اور حنیف راجہ نے اپنا وجود منوانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر دیکھی ہے لیکن چودھری ان کی پیش نہیں جانے دیتے۔ میں نے دونوں صاحبان کی بے بسی دیکھ کر انہیں پیشکش کی تھی کہ وہ میرے ساتھ لندن تک سڑک کے راستے چلیں۔ ایک کو بریڈفورڈ اور دوسرے کو برمنگھم اتار دوں گا جہاں وہ اپنی برادری کے سمندر کا ایک حصہ ہونگے۔ میں نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ قتیل شفائی کے شعر پر غور کریں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ دریا تو سمندر میں گرتے ہیں لیکن کبھی کسی سمندر کو دریا میں گرتے نہیں دیکھا۔ اگر حضرت شعیب بن عزیز کو یہاں اعتراض ہو کہ میں نے قتیل صاحب کا شعر لکھنے کے بجائے اس کا مفہوم کیوں لکھ دیا ہے تو میں انہیں انشاء اللہ پاکستان پہنچ کر بالمشافہ اس کا جواب دے سکتا ہوں لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ وہ جناب چیف منسٹر پنجاب میاں شہباز شریف سے پانچ منٹ کی چھٹی لے کر دکھائیں، اتنی دیر میں درج بالا نثری مفہوم کو میں شعر کی ترتیب میں لے آؤں گا۔ مانچسٹر کے چودھریوں سے بات چلی تھی، کہاں لاہور تک جا پہنچی لیکن مانچسٹر کے ایک چودھری سرور کی عزیز داری لاہور کے چودھری سردار

محمد سے ہے۔ گو سردار صاحب نے چودھری کا سابقہ ضرورت شعری کیلئے لگا رکھا ہے۔ ان کے عزیز اور اصلی ''چودھری'' سرور نے اپنے گھر میں کئی ایک چودھریوں کو بلا رکھا تھا۔ مجھے اس محفل میں ''چودھری'' بنا کر بٹھا دیا گیا۔ لیکن چودھراہٹ انہی حضرات نے جمائے رکھی۔ میں بھی چپکے سے ان کی سنتا رہا۔ برطانیہ میں آباد ''بزرگ'' پاکستانی نسل کو

اب اپنی نئی ''انگریز'' نسل کی فکر لاحق ہے۔ یہ بچے برطانیہ میں پیدا ہوئے، اس ماحول میں پروان چڑھے، یہیں تعلیم پا رہے ہیں اور وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں جن کو کرنے لگیں تو انسان کانوں کو ہاتھ لگائے۔ بزرگ پاکستانی اس غم میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ دینی تعلیم کے لئے اگر وہ ان بچوں کو مسجدوں میں بھیجتے ہیں تو مولوی صاحبان کے ہاتھوں ان بچوں کا مستقبل خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ سیانے تو یہی کہتے ہیں کہ اگر برطانیہ میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب اسلام ہے تو اس کا سہرا بھی مولوی کو جاتا ہے لیکن اسلام کی تشریح مسلمانوں کو تفرقے کا شکار بنا رہی ہے۔ برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچے کی زبان انگریزی ہے جبکہ مولوی جدید انگریزی سے نابلد ہے۔ پاکستان کے علاوہ جن دیگر ملکوں کے مولوی صاحبان برطانیہ میں موجود ہیں ان کی اکثریت انگریزی فر فر بولتی ہے لیکن وہ اسلام کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ ہماری بزرگ پاکستانی نسل کے لئے قابل قبول نہیں۔ فلسطین اور کشمیر کے قضیئے نے نئی نسل کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ایران، عراق جنگ اور پھر خلیجی تنازعے نے تضادات کا تحفہ دیا۔ بوسنیا اور چیچنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کے مناظر سیٹ لائٹ پر پیش کئے گئے۔ یورپ اور امریکہ نے ان مسائل سے جس طرح چشم پوشی کی، اس کو نئی نسل محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ان حادثات نے ایک انقلابی سوچ کو بیدار کیا ہے اور جواں نسل کے ذہنوں میں طوفان مچل رہے ہیں۔ بزرگ پاکستانیوں کا خیال ہے کہ اگر مولوی کی تفرقہ بازی نے انہیں کمزور کیا ہے تو اس سے بھی زیادہ خوفناک کردار پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے ادا کیا ہے۔ برطانیہ میں پاکستانی سیاست کیونکر شروع ہوئی اس کی ضرورت تھی یا نہیں اور اس کے کیا نقصانات مرتب ہوئے، اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کرنا کیا چاہئے۔ اس پر اتفاق رائے نظر نہیں آتا۔ چودھری سرور کے گھر پر یو کے مسلم لیگ کے صدر عطاء اللہ جتالہ اور یو کے تحریک استقلال کے صدر چودھری غلام محی الدین بھی موجود تھے۔ عمران خان کی حمایت میں چودھری منظور بھی پیش پیش رہے۔ اس لحاظ سے ان کی گفتگو میرے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ ہر کوئی برطانیہ میں پاکستانی سیاست کے مضمرات سے آگاہ تھا لیکن کوئی ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس پاکستانی سیاست سے چھٹکارا کیونکر پایا جائے۔ یہاں پر انڈین طبقہ بھی موجود ہے لیکن ان کی کوئی سیاسی تقسیم نہیں، وہ سب کے سب اول و آخر

انڈین ہیں۔ دنیا بھر کے یہودیوں کے سرپرست بھی برطانیہ میں آباد ہیں لیکن کیا مجال کہ وہ کبھی اسرائیل کی داخلی سیاسی تقسیم کا شکار ہوئے ہوں۔ بس یہ تو پاکستانیوں کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ پاکستان سے آنے والے سیاستدانوں، وزیروں، مشیروں کو کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ شہر شہر استقبالئے ترتیب دیئے جارہے ہیں۔ ان کارروائیوں سے کیا حاصل؟ نوجوان نسل ایسی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہوتی۔ پرانی نسل کب تک یہ بوجھ اٹھائے گی اور اس کے بعد نئی نسل پاکستانی سیاستدانوں کو پہچاننے سے انکار کردے گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اس جبری بے دخلی سے پہلے رضاکارانہ طور پر پسپائی اختیار کرلیں تاکہ ہمارے بھائی اپنی ساری توجہ اپنے کاروبار اور اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں پر مرکوز کرسکیں اور اگر کسی کو سیاست کا اتنا ہی شوق ہو تو مقامی پلیٹ فارم موجود ہیں۔ جن پاکستانیوں نے اس طرف توجہ دی، وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ گلاسگو میں بشیر مان نے اس روایت کا آغاز کیا تھا اور گلاسگو کے ہی چودھری سرور نے پہلے ''مسلمان پاکستانی'' ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ہمارے کئی بھائی مقامی کونسلوں میں منتخب ہورہے ہیں۔ ان اداروں کی سربراہی کا بھی انہیں شرف حاصل ہے۔ چودھری سرور کے گھر پر موجود مقامی سیاسی قیادت نے رات گئے تک بحث مباحثے کے بعد اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ پاکستانی سیاست کو اب خدا حافظ کہہ دینا چاہئے۔ لیکن ہر ایک ''اگر'' کی شرط عائد کررہا تھا۔ اس ''اگر'' کے پس پردہ مسئلہ ''چودھراہٹ'' کا ہے جس کو ترک کرنے پر فی الحال کوئی تیار نہیں لیکن اسے ترک کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔

اوورسیز پاکستانیوں کے اتحاد کی بات آگے بڑھی ہے

برطانیہ میں آباد پاکستانیوں کو اب پورا احساس ہوگیا ہے کہ ان کے بیشتر مسائل کا سبب کمیونٹی کا انتشار ہے اور آئندہ اس انتشار و افتراق پر قابو پاکر ہی اپنا وجود قائم رکھا جاسکتا ہے۔ مانچسٹر کے پاکستان فورم نے گولڈن جوبلی کی تقریب منعقد کی تو اس کے مہمان خصوصی ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع تھے۔ پاکستان فورم کی

صدارت چودھری محمد سرور کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بڑے مدلل طریقے سے پاکستانی کمیونٹی پر زور دیا کہ ملک کی سیاست کے بجائے برطانیہ کی سیاست میں دلچسپی لی جائے۔ انہوں نے بتایا کہ انڈیا کی کوئی سیاسی جماعت برطانیہ میں سرگرم عمل نہیں ہے، اس طرح اسرائیل کی بھی کسی سیاسی جماعت کا یہاں وجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک طرف تو اس ملک کی سرزمین پر منظم اور متحد ہیں اور برطانوی سیاست میں انہیں کامیابی مل رہی ہے، دوسری طرف وہ بھارت اور اسرائیل کے لئے بھی طاقت اور اعتماد کا باعث ہیں۔

سرور صاحب نے بتایا کہ اگر پیپلز پارٹی کی قیادت برطانیہ میں پارٹی کو منظم نہ کرتی تو پاکستان کی دوسری سیاسی جماعتیں بھی شاید یہاں نہ آتیں۔ لیکن اس وقت ایک ہڑبونگ مچی ہوئی ہے جو سیاستدان یا وزیر مشیر جس کسی کے گھر آ کر ٹھہرتا ہے، وہ اپنا ایک الگ گروپ تشکیل دے دیتا ہے۔ اس سے پاکستانیوں کی انرجی ضائع ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں پاکستانی کمیونٹی تعداد میں کم ہے۔ لیکن وہاں ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن بے حد منظم ہے اور امریکی حکومت اور انتظامیہ میں اسے گہرا اثر ورسوخ حاصل ہے۔ کئی مواقع پر اس ایسوسی ایشن نے بڑے تاریخی فیصلوں کے پیچھے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ سولارز اور پریسلر جیسے متعصب اور پاکستان دشمن افراد کو شکست سے دوچار کرنا انہی کا تاریخی کارنامہ ہے۔ براؤن ترمیم کی منظوری میں چودھری رشید اور ان کے دوستوں نے کامیاب لابی کی۔ اگر برطانیہ میں آباد پاکستانی بھی رخنہ اندازی اور انتشار پر قابو پا کر اپنے آپ کو متحد کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں یہاں کی سیاست میں حاوی ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ اب تک 50 سال کے عرصے میں پاکستانیوں کو صرف ایک کامیابی ملی ہے اور وہ بھی گلاسگو سے جہاں پاکستانی بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ تاہم انہوں نے محمد سرور کو ایم پی منتخب کر کے تاریخ میں اپنا نام روشن کر لیا ہے۔ اگر برمنگھم، بریڈفورڈ اور مانچسٹر کی پاکستانی برادری بھی فیصلہ کر لے کہ وہ اپنے اندر سے نمائندے منتخب کریں گے تو انہیں اپنی اکثریت کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے ماشا سنگھ کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں چودھری محمد سرور نے پاکستانی ہائی کمشنر سے درخواست کی کہ وہ حکومت پاکستان پر زور ڈالیں اور اوورسیز پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے فیصلے پر عملدرآمد سے روکا جائے۔ اس اقدام سے پاکستانی سیاست کی مداخلت یہاں مزید بڑھ جائے گی اور ''جوتم پیزار'' شروع ہو جائے گی۔ چودھری سرور نے مانچسٹر میں متعین قونصل چودھری عبدالحمید وڑائچ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انہوں نے مانچسٹر کی جامع مسجد کے برسوں پرانے انتشار کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرور صاحب نے ہائی کمشنر سے درخواست کی کہ

اگر وہ اپنے قونصل کو سیاسی اتحاد کے لئے کام کرنے کی اجازت دیں تو کامیابی کی امید کی جاسکتی ہے۔ ہائی کمشنر میاں ریاض سمیع جو بڑے خوشگوار موڈ میں تھے، تقریر کیلئے اٹھے۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ میں ان کی دوسری ٹرم ہے اور وہ شروع سے اہل وطن کو متحد کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں لیکن جب حالت یہ ہو کہ ہر کوئی فساد پر آمادہ ہو تو اس میں ہائی کمشنر یا اس کا عملہ کیا کرے۔ میاں صاحب نے انڈین اور یہودی لابی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ ملک کی خاطر متحد ہیں اور وہ اپنے اپنے ملکوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ پاکستان فورم کی رسمی تقریب ختم ہوئی تو ڈنر کے دوران کئی دوستوں اور بزرگوں سے بات چیت ہوئی۔ ہر کوئی اس حق میں تھا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو برطانیہ میں کام کرنے سے روکا جائے اور ووٹ کا حق دینے کے فیصلے پر بھی عمل نہ کیا جائے۔ برطانیہ میں پاکستانیوں کو مقامی سیاست کی طرف راغب کرنے کے لئے چودھری منظور اور غلام محی الدین چودھری نے دوسرے شہروں میں نمائندہ پاکستانیوں سے رابطہ شروع کر دیا ہے۔ دونوں اصحاب ایک روز اس مقصد کے لئے گلاسگو گئے جہاں پہلے تو محمد سرور ایم پی کے ساتھ تین گھنٹے تک اس موضوع پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ بعدازاں چودھری سرور صاحب نے اشرف انجم، مقبول رسول، سرفراز احمد، میر بشیر اور ملک غلام ربانی کو بھی اپنے گھر مدعو کر لیا۔ تفصیلی صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ اس کام کو مہم کے طور پر شروع کیا جائے اور برطانیہ کے تمام شہروں میں پاکستانی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لئے مقامی سطح پر کمیٹیاں تشکیل دی جائیں اور آگے چل کر ان کاوشوں کو پورے برطانیہ میں منظم کیا جائے۔ اس طرح ایک ایسی فضا پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جس میں برطانیہ کی پاکستانی آبادی اپنی صلاحیتوں کو باہمی جھگڑوں کی نذر کرنے کے بجائے اتحاد کے ساتھ مثبت مقاصد کے لئے جدوجہد کر سکتی ہے۔

دہشت گردی بیرونی سرمایہ کاری کی راہ میں حائل ہے

جس روز راولپنڈی میں ایرانیوں کے خلاف دہشت گردی کا واقعہ ہوا، میں مانچسٹر میں چودھری نصیر کے گھر پر تھا، شہر کی معروف شخصیت حاجی عبدالرشید بھی ان کے سہاں مدعو تھی۔ چودھری نصیر کا برسوں تک چودھری ظہور الٰہی سے تعلق رہا ہے اور ان کی المناک وفات کے بعد چودھری شجاعت اور چودھری پرویز الٰہی سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ چودھری عبدالغفور کی میزبانی کا موقع بھی انہیں ملتا رہا۔ میرے آنے سے پہلے انہی کے گھر پر پیر

نصیر الدین شاہ آف گولڑہ شریف کے ساتھ مانچسٹر کے ''شرفاء'' کی میٹنگ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے فرزند راولپنڈی شیخ رشید کے ساتھ بھی ان کے ہاں ایک خصوصی محفل برپا ہوئی۔ چودھری نصیر مجھے کسی استقبالیے میں گھیرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا جب بھائیوں کے سے تعلقات ہوں تو پھر تکلفات کے پردے درمیان میں حائل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی ہر مجلس میں ایک جیسے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں پاکستانیوں کی دنیا محدود ہے، ان کا آپس میں ہی ملنا ملانا ہے۔ پاکستان سے کوئی بھی مہمان آ جائے، اس بہانے وہ آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ راولپنڈی میں اس دہشت گردی کے پس منظر میں ہماری بات چیت زیادہ تر پاکستان میں لا اینڈ آرڈر کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر مرکوز رہی۔ اس نکتے پر تو سبھی کا اتفاق تھا کہ اس دہشت گردی کے پیچھے پاکستان کے دشمنوں کے مذموم منصوبے کارفرما ہیں۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ پاکستانی حکومت ٹک کر کوئی کام نہ کر سکے اور اسے امن و امان کے مسئلے میں ہی الجھا دیا جائے۔ چودھری نصیر نے افسوس کا اظہار کیا کہ دہشت گردوں کے ہاتھ اس قدر لمبے ہیں کہ انہوں نے چند ماہ قبل ایس ایس پی اشرف مارتھ کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ کسی کو یہ خوف بھی نہ آیا کہ یہ نوجوان وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین کا قریبی عزیز ہے۔ چودھری نصیر اپنے تعلق اور قربت کی وجہ سے اشرف مارتھ مرحوم کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔ حاجی رشید کہہ رہے تھے کہ ہمارے دشمن ہمارا

سیاسی استحکام نہیں دیکھ سکتے۔ ملک میں مسلم لیگ کی حکومت لامحالہ پاکستان کی خالق جماعت کی حیثیت سے اس کی ترقی و خوشحالی کی منصوبہ بندی کرے گی، ویسے بھی مسلم لیگ کی حکومت کو سابقہ ٹرم میں موٹروے اور اس طرح کے دیگر کئی منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جنہیں کوشش کر کے اب تیزی کے ساتھ مکمل کیا جا رہا ہے۔ پاکستان فی الوقت ایک اہم جغرافیائی محل وقوع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے شمال میں افغانستان، ازبکستان، تاجکستان، آذربائی جان، ایران اور ترکی تک ایک بہت بڑی اور وسیع مارکیٹ ہے۔ یہ پورا علاقہ ایکو تنظیم میں شامل ہے اور اگر پاکستان میں سکون آ جائے تو پوری دنیا پاکستان کے راستے وسط ایشیا کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرنے کے لئے آگے بڑھے گی۔ اس راہداری کا ہمیں بیٹھے بٹھائے فائدہ ہو گا لیکن ہمارے دشمنوں کو ہمارا یہ فائدہ قابل قبول نہیں۔ ہمارے ملک کو قرضوں سے آزاد کرانے کے لئے غیر ملکی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اوورسیز پاکستانی اپنا کردار ادا کرنے کے لئے بے تاب ہیں لیکن وہاں تو کسی کی جان و مال کو ہی تحفظ حاصل نہیں۔ قتل و غارت، چوری، ڈکیتی، تخریب کاری اور دہشت گردی نے زندگی شل کر کے رکھ دی ہے۔ ایسے ماحول میں تو خود پاکستان کے اندر سرمایہ کار اپنی تجوری یا اکاؤنٹ کھولتے ہوئے

ڈرتا ہے، باہر سے کسی کے جانے کا کیا سوال۔ چودھری نصیر احمد نے کچھ عرصہ قبل جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کا سفر کیا تھا۔ جاپان، جنوبی کوریا، سنگاپور، ملائیشیا تو ترقی کی دوڑ میں آگے نکل ہی چکے ہیں، اب انڈونیشیا، فلپائن، تھائی لینڈ جیسے ممالک بھی انگڑائی لے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بنگلہ دیش کی پوزیشن بھی مستحکم ہو رہی ہے لیکن ہمارے ہاں ''وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے'' والا معاملہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے زندگی کی رمق ہی ختم ہو گئی ہے۔ اوپر سے بدامنی نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ حکومت، انتظامیہ اور پولیس کا سارا وقت لاء اینڈ آرڈر پر خرچ ہو جاتا ہے۔ معاشی استحکام کیلئے موزوں منصوبہ بندی کے خدوخال طے کرنے کے لئے کسی کو وقت ہی نہیں ملتا۔ چودھری نصیر احمد کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں جب تک لوگوں کے پاس اسلحہ ہے، بدامنی پر قابو پانا ممکن نہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ محض اعلان نہ کرے بلکہ اسلحہ واپس لینے کے حکم پر سختی سے عملدرآمد کرائے۔ اس کے لئے تو ایک روز کرفیو لگا کر پورے ملک کی چھان بین کر لینی چاہئے۔ ہنگامی صورتحال سے نبٹنے کے لئے ہنگامی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس لئے موجودہ حکومت کو ہنگامہ خیز قوتوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہئے اور ایسا ملک گیر آپریشن کرنا چاہئے جس کے ذریعے بدامنی کا خاتمہ ہو سکے۔

برطانیہ کے پاکستانی کونسلرز

راچڈیل میں چودھری عبدالحمید 1972ء سے کونسلر منتخب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک روز ان کا فون آیا کہ انہوں نے نارتھ ویسٹ ریجن کے منتخب پاکستانی کونسلروں کا ایک اجلاس بلایا ہے۔ میرے لئے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ غلام محی الدین مجھے راچڈیل میں چودھری صاحب کے پاس پہنچا آئے۔ پورے برطانیہ میں چار ریجن ہیں جہاں سے اس وقت کل ڈیڑھ سو کونسلر منتخب ہو کر کام کر رہے ہیں۔ ہر ریجن میں ان کی ایک تنظیم بن چکی ہے لیکن نارتھ ویسٹ ریجن کے 30 کونسلروں کی تنظیم سب سے زیادہ فعال ہے۔ یہ لوگ باقاعدگی سے اپنے اجلاس کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر ان مسائل کا حل سوچتے ہیں جو ان کے علاقوں میں پاکستانیوں یا کشمیریوں کو درپیش ہیں۔ چوھری عبدالحمید نے بتایا کہ انہیں اپنے تمام ساتھیوں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اگرچہ ہر رکن الگ الگ سیاسی نظریات رکھتا ہے مذہبی اعتقادات بھی مختلف ہو سکتے ہیں برادری کا بھی فرق ہے، لیکن اجتماعی مسائل پر سب متحد ہیں۔ راچڈیل اور ساہیوال کو جڑواں شہر بھی قرار دیا جا چکا ہے جس کی بناء پر کئی منصوبوں پر اشتراک عمل ہو

رہا ہے۔ سب سے زیادہ تعاون تعلیم کے شعبے میں ہے۔

چودھری عبدالحمید اور ان کے ساتھیوں کا اندازہ تھا کہ 50 سے زائد برٹش ایم پی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کے لئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ان پر صحیح طریقے سے کام کیا جائے۔ اس کا ایک روز مسئلہ کشمیر پر غور وخوض کے لئے وقف ہوگا اور دوسرے دن اوورسیز پاکستانیوں کے مسائل کا جائزہ لیا جائیگا۔

چودھری عبدالحمید کو ان کے ساتھیوں نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے اجلاس کے شرکاء کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ پھر میں نے فرداً فرداً ان کو اظہار خیال کی دعوت دی تمام دوست مجھ سے پاکستان کے حالات پر تبصرہ سننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا تمام واقعات بلاکم وکاست ''جنگ'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ میں اپنے میزبانوں کا نقطہ نظر جان سکوں۔ تمام دوست ایک بات پر متفق تھے کہ ان کی نئی نسل کا مستقبل واضح نہیں ہے کیونکہ ان کو دینی تعلیم انگریزی میں دینے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ پاکستان سے جو علمائے کرام تشریف لاتے ہیں وہ نئی نسل تک اپنا ماضی الضمیر واضح کرنے سے قاصر ہیں۔ نئی نسل ابھی تک ان تعصبات سے محفوظ ہے جس میں پرانیسل گرفتار ہے۔ لیکن جب کبھی عید کا موقع آتا ہے تو ایک ہی کلاس کے آدھے بچے ایک دن عید کی چھٹی کرتے ہیں اور آدھے بچے دوسرے دن۔ اس کی وجہ وہ انتشار ہے جو بزرگ نسل کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ بچوں کے ساتھ یہ ایسی بدسلوکی ہے جس کا سلسلہ فوری طور پر روکنے کی ضرورت ہے۔ کونسلر ثالث رضا کیانی نسبتاً نوجوان عمر کے ہیں کونسلر عبدالعزیز اور کونسلر خالد محمود بھی نوجوان ہیں انہوں نے اس دکھ کا اظہار کیا کہ برطانیہ میں پاکستانیوں کی تعداد لاکھوں میں ہے لیکن اب تک ہم صرف ایک ایم پی منتخب کرا سکے ہیں۔ برمنگھم اور بریڈفورڈ سے تو حالیہ الیکشن میں بڑی آسانی سے کئی ایم پی منتخب کرائے جاسکتے تھے لیکن ہم لوگ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف رہے اور پاکستانیوں کی ایک پکی سیٹ ماشا سنگھ کو چلی گئی۔

کونسلر محمد حسین ملک نے کہا کہ ہمیں سوچنا چاہئے کہ کب تک اہل مغرب کے عناد کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہ لوگ انسانی حقوق کے نام پر عالم اسلام کے ایسے واقعات کو اچھالتے رہتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑے معمولی ہوتے ہیں لیکن یہ پراپیگنڈے کے زور سے رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا کے مشرقی حصے میں مظالم کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کو اپنے ہمسائے میں بوسنیا کے جہنم زار میں جھانکنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ یہاں مظالم کا شکار مسلمان ہیں جن سے اہل مغرب کو قطعاً ہمدردی نہیں ہے۔ کونسلر خالد محمود پیشے کے اعتبار سے ٹیچر ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے بچے ڈرگ کے نشے میں مبتلا ہیں اور

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے بڑوں نے پیسوں کی ہوس میں ڈرگ سمگل کی اور اب اس کا نشانہ انہی کے بچے بن رہے ہیں۔ کونسلر محمد حسین نے لقمہ دیا کہ بات یہیں تک محدود نہیں۔ ڈرگ کا شوق پورا کرنے کے لئے ہمارے بچے چوری کی عادت میں مبتلا ہیں اور ان میں کئی ایک پولیس کے ہتھے چڑھ کر جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ کونسلر رحمت علی راجہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا کہ ہماری کمیونٹی کو پاکستانی سیاست کی بجائے مقامی سیاست میں حصّہ لینا چاہئے۔ 99ء میں سکاٹش پارلیمنٹ اور یورپی پارلیمنٹ کے انتخابات ہو رہے ہیں اور اس کے بعد 2002ء میں برطانیہ کا الیکشن آ جائے گا۔ ہمیں ان مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور باہمی اتحاد کا مظاہرہ کر کے زیادہ سے زیادہ نمائندے منتخب کرانے چاہئیں۔ کونسلر محمد نجیب نے کہا کہ ہماری نسل کی حد تک پاکستان سے واسطہ رہے گا لیکن ہمارے بچے واپس جانے کا نام بھی نہیں سننا چاہتے۔ کونسلر محمد خان سب سے معمر جہاندیدہ اور تجربہ کار نظر آتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ خدا ہمیں اس مقصد میں کامیاب کرے جس کے لئے ہم سب اپنے گھروں سے دور ہیں۔ ہماری یہ بھی دعا ہے کہ خدا ہماری وہ آرزوئیں بھی پوری کرے جو ہم اپنے پیارے وطن پاکستان کے لئے کرتے ہیں۔ ہماری یہ بھی دعا ہونی چاہئے کہ ہمارے بچے ہماری طرح محنت کے عادی ہوں اور پاکستان کا نام روشن کریں۔ محمد خان کے ہاتھ خدا کے حضور پھیلے ہوئے تھے اور کانفرنس ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہر کونسلر بلند آواز سے آمین کہہ رہا تھا۔

ہڈرزفیلڈز کے ایک محبّ وطن پاکستانی کی کہانی

برطانیہ میں تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں اور پاکستانی کمیونٹی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ روٹی کمانا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے جو لوگ معمولی محنت سے خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اب وہ صعوبتوں کا شکار ہیں۔ روزگار کے مواقع سکڑ گئے ہیں۔ اوپر سے ان کے اہل خانہ بھی ان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ کہاں یہ لوگ ایک کمرے میں باقی نوجوانوں کے ساتھ فرش پر بستر لگا کر گزارہ کر رہے تھے اور کہاں یہ عالم کہ خاندان والوں کے لئے الگ مکان کی ضرورت پڑ گئی۔ اخراجات میں بیٹھے بٹھائے تین چار گنا اضافہ ہو گیا۔ یہی رقم وہ پاکستان بھجوا دیتے تھے تو ملک کو کثیر زرمبادلہ مل رہا تھا اور گھر والوں کے وارے نیارے الگ تھے۔ اب ملک بھی قیمتی زرمبادلہ سے محروم ہو رہا ہے اور گھر والوں کا ''ولایت'' آنے کا ''چا'' بھی پورا ہو

گیا ہے۔ پہلے صرف ایک آدمی کی محنت سے سارا کنبہ پل رہا تھا اور اب سارا گھرانہ کولہو میں جتا ہوا ہے۔ لیکن ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آتا۔ آگے مزید تنگی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہڈرز فیلڈ کے چودھری وحید اختر نے شاعر حضرت شاہ کے ساتھ مل کر ایشین آرٹس سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ سوسائٹی مشاعرے کرواتی، ثقافتی تقریبات منعقد کرواتی، ڈرامے، قوالیاں اور مزاحیہ پروگراموں سے کمیونٹی کا دل بہلانے کی کوشش کی جاتی۔ آہستہ آہستہ وحید اختر کو سیاست کا شوق چڑھا۔ وہ مسلم لیگ کی مقبولیت کے بہاؤ کی زد میں آ گئے۔ انہوں نے نئے نئے مسلم لیگی لیڈر متعارف کرائے، انہیں وفود کی شکل میں پاکستان لاتے رہے۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچوں میں پاکستان سے محبت کا رشتہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر پاکستان آنے لگے۔ ان کی بیگم نے ان کا ہاتھ بٹایا اور اس سفر میں بچوں کو پوری شفقت دی۔ یہی وہ دور تھا جب برطانیہ میں کساد بازاری پھیلی، دوسرے لوگوں کی طرح وحید اختر کو بھی آٹے دال کا بھاؤ اچھی طرح معلوم ہو گیا۔ اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ سیاست اور ثقافت سے رشتہ توڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مظفر وارثی، ضمیر جعفری، محسن بھوپالی، جگن ناتھ آزاد، حسن رضوی، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، سلیم کوثر، اجمل نیازی، حمایت علی شاعر، اصغر ندیم سید اور رضا سہیل کی میزبانی کرنے والا نوجوان اب ریستوران کے کاؤنٹر پر کھڑا ہونے کے لئے مجبور ہے۔ اس نے ہڈرز فیلڈ میں ایشین میلہ کی روایت ڈالی تھی۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے، کیا بڑے، ہر ایک کی تفریح طبع کا سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ یہ روایت مستحکم ہو چکی ہے لیکن اب اس کا انتظام اوروں کے ہاتھ میں ہے۔ وحید اختر اس خوشی سے سرشار ہے کہ اس نے جو نئی راہیں تراشی تھیں، دوسرے ان پر چل رہے ہیں۔ خود وحید اختر اب مشین کا ایک پرزہ بن گیا ہے، یہ مشین پیسے کماتی ہے۔ اس کے لئے رات اور دن میں کوئی تمیز نہیں، بلیک پول اور ہڈرز فیلڈ کے درمیان گردش اس کا مقدر بن گئی ہے۔ مہینے میں دو تین مرتبہ یورپ کے چکر بھی لگ جاتے ہیں، ان دوروں کا تفریح سے کوئی تعلق نہیں، مقصد صرف سستا سامان ڈھونڈنا ہے۔ برطانیہ میں ضرورت کی بعض اشیاء مہنگی ہیں۔ زندگی کیسے آگے بڑھ رہی ہے، وحید اختر کو کچھ ہوش نہیں۔ اس کے ریستوران کے سامنے بلیک پول کی ساحلی سڑک میلوں لمبی ہے، ستمبر کے مہینے میں ہر سال کی طرح یہ روشنیوں سے معمور بن جاتی ہے۔ سارا دن لوگ اس پر مٹرگشت کرتے ہیں۔ من چلے جوڑے، دور دراز ملکوں سے آنے والے بوڑھے، حتیٰ کہ معذور افراد بھی اپنی ریڑھیوں میں اس سڑک پر گھومتے نہیں تھکتے۔ وحید اختر نے کچھ دیر تک اس سڑک پر میرا ساتھ دیا تھا، پھر سرِشام ریستوران کھولنے کی ذمہ داری نے اسے مجھ سے الگ کر دیا۔ میں انبوہ آدم میں تنہا رہ گیا تھا، معلوم نہیں سورج کس وقت سمندر کی وسعتوں میں کھو گیا تھا۔ میں گردوپیش سے بے نیاز جگمگ

کرتی روشنیوں کے نیچے چلتا رہا۔لیکن نصف شب کے عالم میں یہ روشنیاں بجھ گئیں۔وحید اختر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ریستوران بند کر کے مجھے یہاں تلاش کر لے گا۔میں ملگجے سمندر کی سطح کو گھور رہا تھا کہ وحید اختر ایک ٹولی کے ساتھ وہاں آن پہنچا۔میں نے بلیک پول کے ساحل پر الوداعی نظر ڈالی۔وحید اختر نے فیصلہ کیا کہ کہ وہ مجھے رات ہی کو مانچسٹر چھوڑ آئے گا۔بلیک پول سے مانچسٹر تک کے سفر کے دوران میں نے اس کو جگائے رکھنے کے لئے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔وہ تھکن کی وجہ سے بار بار آنکھیں بند کر لیتا تھا۔گاڑی کی رفتار نوے میل فی گھنٹہ تھی۔موٹروے پر دونوں جانب گاڑیاں اسی طرح بھاگ رہی تھیں، ہر کوئی جلدی میں تھا جیسے ابھی کام پر نکلا ہو۔میں نے وحید اختر سے پوچھا کبھی پاکستان بھی یاد آتا ہے؟ اس نے کہا: اکثر یاد آتا ہے۔جن جن لوگوں نے پلاٹ یا پیسے دبا رکھے ہیں، وہ سب اچھی طرح یاد آتے ہیں۔یہ سب لوگ اپنے وطن میں ہیں، وطن نے انہیں تحفظ دیا ہوا ہے، میرے جیسے لوگ وطن سے دور ہیں اور ہر تحفظ سے محروم ہیں''۔ ایک وحید اختر نہیں، ہر اوورسیز پاکستانی کا المیہ یہی ہے

پیرس پارساؤں کا شہر نہیں

ہفتے کی صبح پیرس کے چارلس ڈیگال ائرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹم کے تکلفات سے چند سیکنڈوں میں فارغ ہو کر میں باہر نکلا تو اعجاز بھٹی نے اپنی فطری اور روایتی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ان کے ساتھ قاری فاروق، مولانا لال حسین اور مسلم لیگ کے جاوید شیخ بھی موجود تھے۔اعجاز کے ساتھ میرا تعلق قصور کی وجہ سے ہے۔میں اس روز پاکستان واپس آنا چاہتا تھا لیکن اعجاز نے مانچسٹر میں مجھے تلاش کر کے فون پر اصرار کیا کہ جب درمیان میں فاصلہ ایک گھنٹے کی پرواز کا ہے تو ملے بغیر کیوں جا رہے ہو۔پاکستان میں لاہور اور قصور کے درمیان سڑک کا راستہ ایک گھنٹے کا ہے اور اعجاز جب بھی کبھی پاکستان آتے ہیں تو مجھے ضرور ملتے ہیں۔دو سال قبل اکتوبر ہی کی ایک صبح کو میں پہلی بار پیرس آیا تھا تو چند گھنٹوں کے قیام کے باوجود اعجاز نے مجھے آدھے گھنٹے میں پیرس کی سیر کرا دی تھی۔اس وقت میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ سرکاری وفد میں شامل تھا اور کولمبیا کے شہر کارتاہینا میں گیارہویں غیر جانبدار سربراہ کانفرنس اور نیویارک میں اقوام متحدہ کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کے لئے پاکستان سے باہر نکلا تھا۔کسی بھی ملکی سربراہ کے ساتھ یہ میرا دوسرا دورہ تھا اس سے قبل مجھے میاں نواز شریف کے ساتھ ڈھاکہ میں سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا تھا۔میاں صاحب اس دورے کے فوراً بعد ہی

اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ معلوم نہیں میری ہمراہی میاں صاحب پر بھاری گزری تھی۔ اس کے برعکس محترمہ بینظیر میری ہمراہی کے باوجود پورا ایک سال نکالنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ اس میں بینظیر صاحبہ کا کوئی کمال نہیں، اصل کرشمہ تو پس پردہ طاقتیں دکھاتی ہیں۔

پیرس میں ایک پاکستانی ہوٹل میں کھانے کے لئے پہنچا تو اعجاز بھٹی نے ہوٹل میں موجود پاکستانی دوستوں سے میرا تعارف کرادیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قرب وجوار سے کئی اور پاکستانی اپنی دکانیں بند کر کے وہاں آ گئے۔ سیاسی طور پر ان کا رجحان پی پی پی کی جانب تھا اور ان سب کا مشترکہ سوال یہی تھا کہ پاکستان میں کسی حکومت کو ٹک کر کام کیوں نہیں کرنے دیا جاتا۔ جب آئین کے اندر پانچ سال کی ٹرم موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ 85ء سے 97ء تک کوئی بھی حکومت اپنی آئینی ٹرم پوری نہیں کر سکی۔ ان دوستوں کا یہ بھی گلہ تھا کہ محترمہ بینظیر کے ساتھ زیادہ تعصب کا سلوک کیا جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں میاں نواز شریف کو دو تہائی سے زیادہ اکثریت دلائی گئی ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میاں نواز شریف کے ساتھ تو زیادہ برا سلوک روا رکھا گیا ہے کیونکہ ان کی حکومت کو تو سپریم کورٹ نے بحال کر دیا تھا، پھر بھی ایک ماہ بعد اسے چلتا کر دیا گیا لیکن میرے پیرس کے ان دوستوں کو یہ دلیل قبول نہیں تھی۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ پی پی پی پاکستان کی اصل سیاسی عوامی قوت ہے، اگر انتخابات آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں تو پی پی پی ملک گیر اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کی پوزیشن ثابت کر سکتی ہے اور اگر اس حکومت کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے جائیں، اس کے خلاف اپوزیشن ہنگامہ آرائی نہ کرے اور ریاست کے دوسرے ادارے بھی مداخلت سے گریز کریں تو پی پی پی ملک کو سیاسی استحکام سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ پیرس کے ان دوستوں کا اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ اگر ملک کو معاشی بدحالی اور بحران سے بچانا ہے تو پھر کچھ عرصے کے لئے قومی حکومت تشکیل دی جانی چاہئے جس میں ملک کی مقبول عوامی سیاسی جماعتیں اور فوج کو شامل کیا جائے۔ یہ تجویز تقریباً وہی ہے جو پاکستان میں کچھ عرصہ قبل محترمہ بینظیر بھٹو بھی پیش کر چکی ہیں۔ اس مجلس میں موجود پاکستانی دوستوں کا خیال تھا کہ کہ پاکستان میں کرپشن کے سلسلے میں سیاستدانوں کو بلاوجہ بدنام کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں ملک کی بوٹیاں نوچنے والے بعض دیگر عناصر ہیں جو سیاستدانوں کو موردالزام ٹھہرا کر اپنی پانچوں گھی میں رکھتے ہیں۔ عوام کی گالیاں سیاستدانوں کو کھانا پڑتی ہیں اور عیاشی پس پردہ عناصر کرتے ہیں۔ میں نے ان دوستوں کو سمجھایا کہ اگر سیاستدان مضبوط ہوں، صاحب کردار ہوں، معاملے کے کھرے ہوں اور ان کے ہاتھ دیکھنے میں بھی صاف ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کوئی دوسری قوت انہیں بدنام کرنے میں کامیاب ہو سکے یا ان کی حکومت اور سیاسی نظام کو کمزور کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

سیاستدانوں کو اپنے قدم مضبوطی سے جمانے چاہئیں۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ میں بھی تو آخر سیاستدان ہی مدتوں سے نظام حکومت چلا رہے ہیں۔ ان کو ناکام کرنے والی قوتیں ان ملکوں میں بھی موجود ہیں مگر سیاستدان اپنے سسٹم کے ساتھ مخلص ہیں جس کی وجہ سے باقی قوتوں کا سر ہمیشہ نیچا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیاسی اور جمہوری نظام کے ساتھ اخلاص اور سنجیدگی کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ شاہد ریاض، اصغر صغیر، خان اقبال، صوفی عابد، احسان، سجاد احمد اور افتخار کے سوالات ختم ہونے کو نہ آ رہے تھے۔ بحث طویل ہوتی جا رہی تھی۔ اعجاز بھٹی نے ان دوستوں سے اجازت چاہی کہ مہمان کو ذرا گھومنے پھرنے کا موقع بھی دیں۔ ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر پاکستانی ہوٹل سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور سیدھے شانزے لیزے جا پہنچے۔ گاڑی پارک کرنے کے لئے موزوں جگہ نہ ملی۔ چنانچہ اعجاز بھٹی نے جوش میں آ کر غلط جگہ پارک کر دی۔ اعجاز کا کہنا تھا کہ اگر گاڑی کے لئے صحیح پارکنگ کی تلاش میں رہے تو ساری رات پیرس کی گلیوں میں گھومتے رہیں گے۔ بات درست تھی۔

شانزے لیزے پر حسن اور شباب کا ایک سمندر موجزن تھا۔ دنیا سو رہی تھی اور شانزے لیزے دن سے زیادہ روشن تھی، کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہنستے مسکراتے جوڑے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ریستورانوں میں جام چھلک رہے تھے۔ من چلے نوجوانوں کی ٹولیاں کبھی کبھار ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ وگرنہ ہر شخص اپنی دنیا میں مست تھا اور یہ دنیا ہر شخص کی بغل میں تھی۔

معلوم نہیں ہم شانزے لیزے کے کتنے چکر کاٹ چکے تھے۔ میں گننا بھی چاہتا تو ایسا ممکن نہ تھا۔ میری پنڈلیاں درد کر رہی تھیں۔

ایک ریستوران میں کافی پینے کے لئے گھس گئے۔ اندر کوئی اور ہی ماحول تھا۔ ہر رنگ، نسل، مذہب اور عمر کے لوگ مختلف میزوں پر بیٹھے تھے، سامنے ایک چبوترے پر ایک نوجوان جوڑا نغمہ سرا تھا۔

''پیرس میں کوئی پارسا نہیں، پیرس پارساؤں کا شہر نہیں''

جب بھی لڑکی لے میں آ کر اس مصرعے کو دہراتی تو ریستوران میں ایک شور سا اٹھتا۔ ہر کوئی وقت سے بے نیاز تھا لیکن ریستوران سے باہر سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا۔

دنیا جاگ رہی تھی اور شانزے لیزے ساری رات کی تھکن دور کرنے کے لئے اپنی روشنیاں گل کر کے سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

پیپلز پارٹی کیلئے امید کی کرن

فرانس میں پیپلز پارٹی کے صدر اشرف گوندل کو پہلا باضابطہ منتخب صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے فرانس میں پیپلز پارٹی کو متحرک اور سرگرم رکھنے میں کوشاں ہیں۔ کئی مرتبہ پیرس میں محترمہ بینظیر اور دیگر پارٹی عہدیداران کا استقبال کر چکے ہیں اور ان کے سامنے اوورسیز پاکستانیوں کی مشکلات بیان کر چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ چند ایک مطالبات منوانے میں کامیاب رہے ہیں جن میں سرفہرست پیرس سے اسلام آباد اور لاہور کے لئے پی آئی اے کی پرواز ہے، کرایوں میں کمی کا فیصلہ بھی پی پی پی کے دور حکومت میں ہو گیا تھا۔ پیرس میں سیاسی نظریات سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کو حکومتی عہدیداروں سے ملوایا جاتا تھا۔

اشرف گوندل کہتے ہیں کہ وطن سے باہر تمام پاکستانی یکساں سلوک کے مستحق ہیں لیکن اب میاں نواز شریف نیویارک جاتے ہوئے پیرس رکے تو انہوں نے پاکستان کے تمام طبقات سے تو کجا، مقامی مسلم لیگی قیادت سے بھی باضابطہ ملاقات کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے پوچھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کیوں ختم ہوئی؟ انتخابات میں ناکامی کی کیا وجہ تھی؟ اشرف گوندل نے کہا کہ حکومت کا خاتمہ ایک سازش کے تحت کیا گیا۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ملک کے بعض طبقات کو پی پی پی کی حکومت برداشت نہیں ہوتی، اسے چار و ناچار اقتدار دے دیا جاتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی چھٹی کرانے کے منصوبے سوچے جاتے ہیں۔ گزشتہ برس بینظیر کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لئے تمام حربے استعمال کئے گئے۔ اب تک ہر شخص پر حقیقت آشکارا ہو چکی ہے۔ دراصل کچھ لوگ ملک میں ''انقلاب'' برپا کرنے کے شوق میں مبتلا تھے۔ وہ آئین کو معطل کر کے دو سال تک اصطلاحات کے ''جادو'' سے کسی تیسری قوت کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ اگر محترمہ بینظیر بھٹو انتخابات کا بائیکاٹ کر دیتیں تو پھر دو سال تک نگران حکومت کو چلانے میں آسانی ہوتی۔

محترمہ کو معلوم تھا کہ انتخابات میں ان کی شکست کا بندوبست کر لیا گیا ہے لیکن پھر بھی انہوں نے میدان نہیں چھوڑا جس کی وجہ سے سیاسی عمل جاری وساری رہا۔ لیکن پولنگ کے دوران ووٹروں کی غیر حاضری کو ہر کسی نے محسوس کیا۔ دراصل پاکستان کے ووٹر ہر دو اڑھائی برس سے بعد انتخابات سے تنگ آ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو الیکشن ڈرامے سے دور رکھ کر دراصل سازشی عناصر کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔ اب یہ تو کسی جادو کا کرشمہ ہے کہ جن پولنگ بوتھوں پر ہو کا عالم رہا وہاں سے بھی مسلم لیگ کو بھاری اکثریت دلوائی گئی اور پراپیگنڈے کے زور سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ صرف پیپلز پارٹی کا ووٹر گھر سے نہیں نکلا اور یہ کہ اس نے پارٹی کی غلط کاریوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ یہ سب کچھ بے بنیاد پراپیگنڈہ تھا۔ پیپلز پارٹی کا ووٹر اگر باہر آ بھی جاتا تو پھر بھی الیکشن کا نتیجہ یہی ہوتا۔ آخر اقتدار سے ٹھوکر ماری جانے والی پارٹی کو واپس اقتدار میں آتے کون دیکھ سکتا ہے۔ میں نے کہا سنا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا ورکر محترمہ کے دور حکومت میں ناخوش تھا۔ اسے مصاحبین کی فوج ظفر موج نے پارٹی قیادت سے دور کر دیا تھا اس کا بدلہ اس نے پولنگ کے روز لیا۔

اشرف گوندل نے کہا کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کو تیار ہیں، قیادت اور ورکر کے درمیان خلیج ضرور حائل کر دی گئی تھی لیکن پیپلز پارٹی کا ورکر سیاسی شعور سے بہرہ مند ہے وہ الیکشن میں اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اسے معلوم ہے پارٹی قیادت کو سزا دینے کا مطلب کوڑے اور قید کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ فروری 97ء کے انتخابات کے نتائج تو اس روز واضح ہو گئے تھے جب محترمہ کی حکومت ختم کی گئی اور پھر مسلسل تین ماہ تک سرکاری مشینری پی پی پی کے خلاف سرگرم عمل رہی۔ اس طرح انتخابی کمپیوٹر میں جو نتائج ڈال دیئے گئے ان کو تبدیل کرنا پارٹی ورکر کے لئے ناممکن تھا۔ اشرف گوندل ان تجزیوں سے اتفاق کرنے کو تیار نظر نہیں آتے تھے جو خود پارٹی کے حلقوں نے انتخابی شکست پر اخبارات میں پیش کئے۔ بہر حال میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ انتخابات میں آپ کی پارٹی واپس اقتدار میں آ

سکتی ہے؟ اشرف گوندل نے جواب دیا اگر چہ یہ نظریہ پھیلایا جا رہا ہے کہ پاکستان میں سیاست اور سیاستدانوں کا لفظ اس قدر بدنام کر دیا جائے گا کہ لوگ سیاست کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں، یوں ایک ایسا ماحول تیار کیا جا رہا ہے جس میں غیر سیاسی جمہوری نظام کے تجربے کو آزمایا جا سکے۔ لیکن پہلے کی طرح ان سازشی عناصر کو پھر شکست فاش ہوئی۔ سیاست پاکستانی عوام کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ ملک ایک سیاسی اور جمہوری تحریک کے ذریعے تشکیل دیا گیا تھا۔ اب اس ملک سے سیاست اور جمہوریت کو ختم کرنا ممکن نہیں، بھٹو کو پھانسی دینے سے بھی سیاست اور جمہوریت کو پھانسی پر نہیں لٹکایا جا سکا۔ یہ عمل جاری ہے اور جاری رہے گا اور جب بھی انتخابات آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے تو پیپلز پارٹی کو اقتدار میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے پوچھا بے نظیر بھٹو کے خلاف کرپشن کے الزامات کا سلسلہ اب سوئس اکاؤنٹ منجمد کرنے تک پہنچ گیا ہے، کیا آپ کے خیال میں محترمہ احتساب کے اس عمل سے بچ سکیں گی؟ اشرف گوندل نے کہا ہم لوگ یورپ میں رہتے ہیں، سوئٹزرلینڈ ہم سے دور نہیں۔ لوگ تو فرانس کے محلات خریدنے کی بات بھی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ ڈس انفارمیشن مہم کا ایک حصہ تھا۔ سوئس اکاؤنٹوں میں اگر کوئی حقیقت ہے تو حکومت پاکستان کو تمام ثبوت سوئس حکام کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن احتساب سیل کے سربراہ نے اب برطانیہ کا رخ کر لیا ہے اور ''پراپیگنڈے'' کا دوسرا ''شو'' چلانے کی کوشش کی جا رہی۔ یہ الزامات تو پی پی پی کی حکومت کے دوران بھی لگائے گئے تھے اور معاملہ ابھی تک وہیں کا وہیں ہے۔ اصل مسئلہ ثبوت کا ہے۔ پراپیگنڈے اور حقیقت میں بہت فرق ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ وہ عوام کو ''احتساب شو'' میں غرق رکھنا چاہتی ہے تا کہ وہ تعلیم، روزگار، علاج معالجے، امن و امان، کاروبار، صنعتکاری و دیگر سہولتوں کا مطالبہ نہ کر سکیں جن کی فراہمی حکومت کی آئینی ذمہ داری ہے لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے مسلسل پہلو تہی کر رہی ہے۔ سندھ کے بعد پنجاب مقتل بن گیا ہے۔ کسی کو جان و مال کا تحفظ نہیں۔ حکومت ان مسائل سے آنکھیں چرا رہی ہے۔ اس کی ایک ہی کوشش ہے کہ وہ امریکہ کو خوش رکھے اور اس کے لئے وہ بھارت سے پینگیں بڑھا رہی ہے۔

کم از کم بے نظیر کے دور حکومت میں امریکی ایجنڈہ پاکستانی قوم کی مجبوری نہیں تھا۔ موجودہ حکومت جو بھی کام کر رہی ہے وہ اس کے اپنے ووٹروں کے لئے بھی نا قابل قبول ہے، نا قابل برداشت ہے اور ہمارے لئے امید کی کرن یہی ہے کہ عوام مسلم لیگ کی کارکردگی سے مایوس ہو کر پیپلز پارٹی کو موقع دیں گے۔

فرانس میں پاکستان مسلم لیگ کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو پاکستانی عوام نے سال کے شروع میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کو دی ہے، لیکن فرانس کی مسلم لیگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ متحد ہے، اس کی ایک آواز ہے اور ایک ہی خواہش ہے کہ میاں نواز شریف کو اپنے اقتدار کی آئینی مدت ضرور پوری کر لینی چاہئے۔ پیرس کے مسلم لیگی حلقوں کو یقین ہے کہ میاں صاحب کی حکومت کو اندر سے کوئی چیلنج درپیش نہیں ہے۔ اب تک میاں صاحب نے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے جو اقدامات کئے ہیں ان میں وہ سرخرو ہوئے ہیں اور ملکی نظام میں انہوں نے اصلاح کے لئے کئی انقلابی پالیسیاں دی ہیں ان کے اثرات فوری طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ پیرس مسلم لیگ کے جن دوستوں سے ایک پر تکلف ضیافت میں ملاقات ہوئی اس کی تحریک مجلس عاملہ کے سربراہ چودھری نسیم اختر کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے بڑی شتابی سے اپنے نائب صدر چودھری محمد حسین، سیکرٹری اطلاعات ملک یاسین اور مجلس عاملہ کے رکن خالد جاوید کو تلاش کر لیا۔ زاہد نقوی بھی اس محفل میں موجود تھے، اور ان کی شرکت ایک دوست کی حیثیت سے تھی۔ اعجاز بھٹی کے بارے میں یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ مرنجاں مرنج انسان ہیں، انہوں نے اب تک دوست ہی دوست بنائے ہیں اور ان کی دوستی سیاست، علاقے، برادری اور دیگر تعصّبات سے ماورا ہے، اگر میرا قیام فرانس میں طویل ہوا تو مجھے لامحالہ بلجیم، لکسمبرگ، ہالینڈ، جرمنی اور سپین تک اعجاز بھٹی کی مقبولیت کے کھلے مظاہرے تلاش کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔

میرے مسلم لیگی میزبانوں کا کہنا تھا کہ پاکستان میں حکومت کسی کی بھی ہو، بیرون وطن پاکستانیوں کے ساتھ سفارت خانوں سے لے کر پاکستانی ائرپورٹوں تک سوتیلا سلوک کیا جاتا ہے،

امیگریشن، کسٹم اور دیگر سرکاری محکموں کے اہل کاروں کا رویہ کسی حکومت کے دور میں بہتر نہیں ہوا۔ چلئے یہ تو ایک مستقل شکایت ہے اور پاکستان کے قومی مزاج کا ایک حصہ ہے لیکن قدرتی آفات کے موقع پر بیرون وطن پاکستانی اگر امدادی سامان اکٹھا کر کے اپنے آفت زدہ بھائیوں کو بھجوانا چاہتے ہیں تو پی آئی اے اور سفارت خانے کے اہل کار پہلے ان سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کا کس پارٹی سے تعلق ہے۔ اس پر مدد کرنے کے شوق میں مبتلا حضرات سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں کہ جب زلزلہ، سیلاب، یا قیامت خیز بارشیں یہ نہیں دیکھتیں کہ ان کی زد میں آنے والے پاکستانی شہری کس سیاسی پارٹی سے متعلق ہیں اور یہ تباہی بلا تفریق سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو پھر امداد دینے والے سے سیاسی پارٹی کی نسبت سوال کا کیا مطلب! ان دوستوں کا دوسرا شکوہ یہ تھا کہ پاکستان کی کوئی حکومت بیرون ملک پاکستانیوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کی ذمہ داری ادا کرنے میں دلچسپی نہیں لیتی جس کی وجہ سے یہ بچے عیسائی، یہودی اور اس طرح کے بیرونی نظریات رکھنے والے سکولوں میں زیر تعلیم ہیں اور ان سکولوں کی تعلیم کے اثرات بھی واضح ہو رہے ہیں کہ یہ بچے پاکستانی ثقافت، تہذیب حتیٰ کہ مذہبی اقدار سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مقامی پاکستانی سفارت خانے کے بارے میں سب مسلم لیگی دوستوں کی بیک زبان رائے تھی کہ اسے پیرس میں مقیم پاکستانیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میاں نواز شریف نے حکومت سنبھالنے کے بعد ''قرض اتارو ملک سنوارو'' کی جو اپیل کی تھی، اس پر مقامی سفارت خانے میں صرف ایک میٹنگ بلائی گئی تھی اور اس میں بھی صرف اتنا کہا گیا کہ پاکستان سے فنڈز اکٹھا کرنے کے لئے ایک خصوصی وفد آئے گا، نہ ہی یہ وفد آیا اور نہ سفارت خانے کی طرف سے دوبارہ انگڑائی لی گئی۔ اوورسیز پاکستانیوں کو شناختی کارڈ، پاسپورٹ یا ملک میں موجود اپنے بیوی بچوں کے کاغذات کے سلسلے میں بھی سفارت خانے سے رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن قدم قدم پر مشکلات اور دشواریاں کھڑی کی جاتی ہیں، فرانس میں پاکستانی بنک کے رویئے پر بھی شکوے شکایت کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دوستوں کا کہنا تھا کہ بنک کے عدم تعاون کی وجہ سے لوگ اپنی

رقوم ہنڈی کے ذریعے پاکستان بھیجنے پر مجبور ہیں۔ میں نے ان صاحبان سے پوچھا کہ پیرس میں تو پاکستان کے وزراء کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ خاص طور پر چودھری شجاعت حسین یہاں ضرور آتے ہیں اور طویل عرصہ قیام کرتے ہیں وہ سابق دور میں بھی وزیر داخلہ تھے، اس طرح اعجاز الحق بھی اوورسیز پاکستانیوں کے وزیر کی حیثیت سے یہاں آئے ہوں گے تو آپ لوگ ان کے سامنے اپنے مسائل کیوں نہیں رکھتے۔ جواب ملا کہ وہ سب میٹھی گولی دے کر چلے جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں جا کر شاید انہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ حکومت کی اب تک کی کارکردگی پر میں نے تبصرہ کرنے کو کہا تو زیادہ تر دوستوں نے کہا کہ ہمیں تو وہی خبریں ملتی ہیں جو آپ لوگ چھاپتے ہیں لیکن ملک وقوم کو جو مسائل درپیش ہیں، وہ پچاس سال میں جمع ہوئے ہیں اور اب انتہائی سنگین ہو چکے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ حکومت کے پاس جادو کی چھڑی یا الہ دین کا چراغ تو نہیں کہ راتوں رات ملک وقوم کی تقدیر بدل کے رکھ دے، لوگوں کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے۔ حکومت کی سمت درست ہے، پالیسیاں بن رہی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ نتائج بھی سامنے آ جائیں گے۔ امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر ان دوستوں نے گہری تشویش کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر حکومت کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ اچھے کام ہوں تو خود کریڈٹ لیتی ہیں لیکن اگر کام خراب ہو رہا ہو تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر تھوپ دی جاتی ہے۔

لیکن یہ اصول غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں اگر کوئی خرابی ہے تو اس کی اصلاح کا ذمہ بھی حکومت وقت کا ہے اور اگر وہ خرابی دور نہ کر سکے تو یہ اس کی کوتاہی ہے۔ بھارت کے ساتھ دوستانہ بات چیت اور تجارتی تعلقات کی استواری کے اعلانات پر ان دوستوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہوئے بغیر بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بہر حال حکومت کو اگر کسی طرح کی خوش فہمی تھی تو حالیہ دورہ امریکہ کے بعد دور ہو جانی چاہئے۔ بھارت کے ساتھ تجارت کو تو یہ دوست خارج از امکان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں پاکستان کا خسارہ ہی خسارہ ہے اور بھارتی بنئے کو فائدہ پہنچانے والی بات ہے۔ میں نے ان

دوستوں سے پوچھا کہ آپ لوگ اپنے آپ کو مسلم لیگی بھی کہتے ہیں، میاں نواز شریف کو اپنا قائد بھی مانتے ہیں لیکن آپ ان کی پالیسیوں کے سو فیصد حامی بھی نہیں ہیں، آخر یہ کیسی پارٹی وفاداری ہے۔ کیا آپ پر کوئی ڈسپلن لاگو نہیں ہوتا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ مغربی معاشرے میں رہتے ہیں۔ یہاں اندھی تقلید کا رواج نہیں، ہر شخص اپنی رائے میں آزاد ہے اور ہمارے ذہنوں میں اس ماحول کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ پارٹی قیادت غلطیوں سے بچے اور ذمہ دارانہ کردار ادا کرے۔ قومی وحکومتی معاملات کو صلاح مشورے سے چلایا جائے۔ اسی میں پارٹی، حکومت اور ملک کی خیر خواہی ہے۔

پاکستان کا تشنہ تکمیل خواب

یورپ کی سرزمین کا پہلا مزا میں نے گزشتہ ویک اینڈ پر چکھا تھا، پیرس سے برسلز تک بلٹ ٹرین کا سفر دو گھنٹے میں طے ہو گیا تھا، دونوں شہر تین سو میل کی دوری پر ہیں۔ آئندہ چند ماہ میں ٹرین کے اس سفر کو مزید نصف گھنٹہ کم کیا جا رہا ہے۔ برسلز جدید و قدیم فن تعمیر کا ایک شاہکار شہر ہے۔ بلجیم کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر میں یورپی پارلیمنٹ کا بھی صدر دفتر ہے۔ میں رات کے وقت یہاں پہنچا تھا اور صبح سویرے کی ٹرین سے واپس پیرس آ گیا تھا۔ اس رات میری ملاقات صرف قاری حیات سے ہو سکی تھی اور ان کے انتظار کے لئے مجھے برسلز کے سٹیشن کے باہر ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ میری اپنی غلطی تھی۔ مجھے ہفتہ کی شام وہاں جانا تھا۔ قاری حیات ساری رات اور اتوار کا دن میرا انتظار کرتے رہے۔ پھر ان کی کوئی مصروفیت روٹرڈیم میں تھی۔ یہ شہر ہالینڈ میں ہے۔ وہ یہاں سے واپس لوٹے تو مجھے اور اعجاز بھٹی کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر کی سیر

کے لئے چل نکلے۔ برسلز میں رات کے وقت دیکھنے کو کچھ نہیں، یہ شہر سرِشام بند ہو جاتا ہے۔ پیرس والی رونقیں یہاں ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ شہر بھی چھوٹا سا ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں برسلز کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔

یورپ میں پاکستانیوں کے ساتھ کوئی بھی پروگرام ویک اینڈ کے حساب سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پیرس سے کسی طرف نکلنے کے لئے مجھے پورا ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ دوسرا ویک اینڈ آیا تو قاری حیات مجھے لینے کے لئے پیرس آ چکے تھے۔ اعجاز بھٹی بھی چلنے کے لئے تیار ہو گئے تھے بلکہ ہم لوگ انہی کی کار میں سفر پہ نکلے۔ سوال یہ تھا کہ کہاں جائیں کہیں بھی جاتے پہنچنا پھر بھی رات کے وقت تھا اور رات کو سوائے سونے کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال کسی منزل کا تعین کئے بغیر ہم پیرس سے نکلے۔ بلجیم اور ہالینڈ جانے والی موٹروے پر گاڑی ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اعجاز بھٹی اپنی ڈرائیونگ کے کمالات دکھا رہے تھے۔ رفتار کی حد تک یہاں کم ہے لیکن برطانیہ کی طرح یہاں کی موٹروے پر نہ تو کیمرے نصب ہیں، نہ کہیں پولیس کی گاڑی نظر آئی۔ سہ پہر کی دھوپ نکھری ہوئی تھی اور موٹروے کے دونوں طرف وسیع و عریض کھیت تھے۔ مکئی کی فصل کاٹی جا چکی تھی اور اکا دکا کھیتوں میں ہارویسٹر اپنا کام کر رہے تھے۔ فرانس بڑا ملک ہے اس لئے تا حدِ نظر کھیت اور دیہات پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں کوئی بڑا شہر آ جائے تو بائی پاس سے گزرتے ہوئے شہر کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کوئی نہ کوئی سڑک گزر رہی تھی۔ ان سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے بعض اوقات گمان ہونے لگتا ہے کہ یہاں سوائے سڑکوں کے اور کیا ہو گا۔

بلجیم میں داخلے کے لئے دو مقامات ہیں۔ ہم نے اس دوران میں طے کر لیا تھا کہ پہلے ہالینڈ جائیں گے اور واپسی پر بلجیم آئیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایک ایسی سڑک اختیار کر لی جس پر ہالینڈ کا سفر اسی میل کم تھا۔ راستے میں ٹول ٹیکس کی ایک چوکی آئی۔ بلجیم اور فرانس کی سرحد پر نہ کوئی باڑ ہے، نہ سرچ لائٹس، نہ فوج کی گشت، موٹروے کے درمیان میں دو گیٹ بنے ہوئے تھے۔ بلجیم میں

داخل ہوئے تو ہالینڈ تک موٹر وے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درختوں نے اردگرد کے منظر کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس لئے بلجیم کی لینڈ سکیپ کا اندازہ نہ ہو سکا۔ ڈیڑھ گھنٹہ مزید سفر کرنے کے بعد ہم ہالینڈ کی سرحد کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ہمیں شبہ ہوا کہ کوئی گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ ہم نے رفتار آہستہ کر دی۔ پیچھے آنے والی گاڑی میں چند نوجوان تھے۔ انہوں نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ لیکن خیریت گزری، نوجوان ہم سے پوچھ رہے تھے کہ اگر ہم ڈرگ کی تلاش میں ہالینڈ جا رہے ہیں تو وہ سپلائی کرنے کو تیار ہیں۔ اہل مغرب نے ڈرگ کی تجارت کے خلاف بہت بڑی مہم چلا رکھی ہے لیکن ان کی اپنی سرزمین پر کھلم کھلا اور دھڑلے سے طریقے سے سودے ہو رہے ہوں تو اس کو کیا کہا جائے۔ پیرس کے پر رونق مقامات پر میں نے نشے کے عادی افراد کو سر عام ٹیکے لگاتے دیکھا ہے۔

ہالینڈ کے اندر داخل ہوئے۔ یہاں بھی کوئی سرحدی لکیر نہ تھی۔ محض سڑک کے دونوں طرف دو برجیوں پر بلجیم اور ہالینڈ لکھا تھا۔ کسی طرح کی کوئی سرحدی چوکی قائم نہیں کی گئی۔ ہم ایک گھنٹے تک مزید سفر کے بعد روٹرڈیم پہنچ گئے۔ پیرس سے چلے ہوئے ہمیں کل پانچ گھنٹے گزرے تھے۔ یہاں ہماری ملاقات منڈی بہاؤ الدین کے دو نوجوانوں ظفر اقبال اور شاہد اکبر سے ہوئی۔ ان کا ریستوران کا بزنس ہے اور وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ کھانے کے لئے وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ یہاں کئی ہفتوں کے بعد پاکستانی کھانے نصیب ہوئے۔ سونے کا انتظام ایک الگ تھلگ فلیٹ میں تھا۔ ضرورت کے مطابق رہائش فراہم کرنے کی ذمہ داری یہاں کی حکومت کی ہے۔ چنانچہ صاف ستھرے اور تمام آسائشوں سے مزین گھر سرکاری نگرانی میں تعمیر کر کے مقامی شہریوں کو الاٹ کر دیئے جاتے ہیں۔

اگلے روز اتوار تھا۔ ہم نے روٹرڈیم شہر کو گھوم پھر کر دیکھا۔ اس شہر کو کشتیوں میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ پورا ہالینڈ نہروں اور دریاؤں سے اٹا پڑا ہے۔ یہاں سے ایمسٹرڈیم کا رخ کیا۔ ہالینڈ

خوبصورت مناظر کے لئے مشہور ہے۔ میں نے ایک ایک دلفریب منظر کو آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ ایمسٹرڈیم سے ہم نے ہیگ کا رخ کیا۔ وہاں مولانا مہر علی ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے اپنے آستانے پر ایک روحانی محفل کا پروگرام بنایا تھا۔ ہم نے شہر میں پہلے تو عالمی عدالت انصاف کی عمارت دیکھی..... چھٹی کی وجہ سے اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ چھٹی نہ بھی ہو تو بھی ہم جیسے لوگوں کو اس بلڈنگ سے انصاف ملنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ہیگ کا شہر بھی اپنی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہمیں مولانا مہر علی کا آستانہ شریف تلاش کرنے میں قدرے دقت ہوئی۔ اگرچہ ہمارے ساتھ روٹرڈیم سے ظفر اقبال بھی رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ تاہم چونکہ ہم چاروں میں سے پہلے یہاں کوئی نہ آیا تھا اس لئے ہمیں ایک دو جگہ رک کر مقامی افراد سے پتہ پوچھنا پڑا۔ ایک شخص کی بتائی ہوئی ڈائریکشن میں چلے تو احمدیہ اشاعت اسلام مرکز جا پہنچے۔ بہر حال مولانا مہر علی کا گھر یہاں سے دور نہ تھا۔ ان کے ہاں بیس پچیس افراد جمع تھے۔ ذکر اذکار کا ہو رہا تھا۔

بعد میں لنگر تقسیم کیا گیا۔ اس محفل میں سری نام کے مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان میں عبدل نامی ایک بزرگ نے حضرت مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے والد گرامی کی خدمات جلیلہ کی تفصیلات بتائیں۔ یہاں ہماری ملاقات منہاج القرآن کے مقامی سربراہ مولانا اورنگ زیب قادری اور خازن امانت علی سے بھی ہوئی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ ہم نے مولانا مہر علی سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بڑے خلوص سے رکنے کو کہا۔ لیکن اعجاز بھٹی اور قاری حیات کو اگلی صبح اپنے اپنے کام پر پہنچنا تھا۔ ظفر اقبال نے مجھے پیشکش کی کہ آپ چند دن یہاں ٹھہریں اور پاکستانیوں اور دیگر مسلمانوں سے مل کر حالات کا جائزہ لیں۔ اس کے بعد وہ خود مجھے پیرس چھوڑ آئیں گے۔ میں نے ان اصحاب کے پرخلوص جذبات کا شکریہ ادا کیا۔ واپسی کا سفر بھی پیرس تک پانچ گھنٹوں کا تھا۔ درمیان میں ہم آدھ گھنٹے تک برسلز میں قاری حیات کے مکان پر رکے۔ رات کے اندھیرے کے باوجود موٹروے پر بھاری ٹریفک تھی۔ سب لوگ ویک اینڈ گزار کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس آ جا رہے تھے۔ ہم بارہ بجے شب پیرس

میں داخل ہو گئے ۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا صرف ایک روز کے اندر تین ملکوں کا سفر طے کر لیا ہے

ظفر اقبال نے مجھے روٹرڈیم کے بارے میں بتایا تھا کہ شہر کی انتظامیہ 2007ء تک روٹرڈیم کو نیویارک کا ہم پلہ بنانا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا ہم بھی پاکستان میں 2010ء تک ایک خواب کی تعبیر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ احسن اقبال ابھی اس خواب کا ناک نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک خواب تو ہم نے جہاد افغانستان کی کامیابی پر بھی دیکھا تھا۔ خدا مغفرت کرے مختار حسن کہا کرتے تھے جیسے ہی روس کی افواج کابل سے نکلیں گی اور وسط ایشیا کی مسلمان مملکتیں آزاد ہو جائیں گی تو پاکستان کے سامنے ایک نئی دنیا اپنے دروازے کھولے کھڑی ہو گی۔ میاں نواز شریف نے خواب دکھایا تھا کہ وہ پاکستان میں موٹر وے اور شاہراہوں کا جال بچھا دیں گے۔ ماڈرن بندرگاہیں اور بین الاقوامی ائرپورٹ تعمیر کریں گے اور پاکستان پوری دنیا کے لئے وسط ایشیاء تک پہنچنے کی راہداری کا کام دے گا۔ مختار حسن مرحوم کا کہنا تھا کہ اسلام آباد سے صبح کی نماز ادا کر کے ناشتہ کابل میں ہو گا، دوپہر کا کھانا تاشقند میں، شام کی کافی بخارا میں پی کر انسان واپس اسلام آباد آ کر رات کی نیند پوری کر سکے گا۔

یورپ کے تین ملکوں میں چوبیس گھنٹے آزادانہ گھومنے پھرنے کے بعد میں سوچتا ہوں میرے وطن پاکستان کا روشن خواب کس روز شرمندہ تعبیر ہو گا ..... وہ شاہراہیں کب بنیں گی جو ملک کے قصبوں اور شہروں سے ہوتی ہوئی افغانستان، ایران، ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، عراق اور ترکی تک ہمارے لئے نئی دنیاؤں کے دروازے کھولیں گی۔

اوورسیز پاکستانی۔ خوش رہو اہل وطن،
ہم تو ''سفر'' کرتے ہیں

بیرون وطن مقیم پاکستانیوں کو دل بہلاوے کے لئے اسلام آباد بلایا گیا، سابقہ ادوار کے

اوورسیز کنونشنوں کی طرح اب کے بھی خوب تقریریں ہوئی ہیں اور حسب معمول ان تقریروں میں پیش کی گئی تجاویز پر عمل درآمد کے خوش کن وعدے کئے گئے لیکن الفاظ تو ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ آنے والے مہمان ہواؤں کے دوش پر واپس چلے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے معمولات بڑے کٹھن ہیں۔ چند ہی روز بعد انہیں یاد بھی نہیں ہوگا کہ اسلام آباد میں کیا کچھ کہا گیا، کیا کیا وعدے ہوئے۔

بیرون وطن پاکستانیوں کو سلام کہ انہوں نے محنت کی عظمت کے اسلامی اصول کو برحق ثابت کیا ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں پاکستانی اپنی ثقافت اور تہذیب کے تمام مظاہر کے ساتھ موجود نہ ہوں۔ اکثر ممالک میں اب پاکستانیوں کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ اوورسیز پاکستانیوں نے نہ صرف اپنا پیٹ پالا اور اپنے کنبے کی کفالت کی بلکہ ان کا قیمتی زرمبادلہ پاکستان کے قومی خزانے کے لئے گلوکوز بھی ثابت ہوا۔ یہ المیہ اپنی جگہ پر ہے کہ اہل پاکستان نے اپنے اوورسیز بھائیوں کو دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ او پی ایف کو ''اپنا'' پیٹ بھرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ اس ادارے نے اپنے ارکان کو فائدہ پہنچانے سے حتی المقدور پرہیز کیا۔ اگر اوورسیز پاکستانیوں نے وطن میں اپنی خون پسینے کی کمائی سے کوئی جائیداد بنائی، کارخانہ قائم کیا، سرمایہ کاری کی تو جس کا داؤ چلا اس نے اپنے بیرون وطن پاکستانیوں کو ڈسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ لیکن آفرین ہے اوورسیز پاکستانی بھائیوں پر کہ ان کے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آتا۔ وطن جب بھی انہیں پکارتا ہے وہ والہانہ طور پر لبیک کہتے ہیں۔

تارکین وطن کا اس وقت بڑا سنگین مسئلہ پاسپورٹ کی تجدید اور شناختی کارڈ کا اجراء ہے۔ شناختی کارڈ کے بغیر نیا پاسپورٹ نہیں بن سکتا۔ پاکستان کے اندر جائز طریقے سے شناختی کارڈ کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پاکستان سے باہر شناختی کارڈ کے حصول کے لئے متعلقہ ملک میں پاکستانی سفارت خانے سے رجوع کرنا پڑتا ہے جو شناختی کارڈ کے کاغذات واپس ملک بھیج دیتا ہے اور اس کے بعد ان کا کچھ اتا پتہ نہیں چلتا۔ وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ اگر ذرا سی

کو آرڈینیشن سے کام لیں تو بیرون وطن بھائیوں کی یہ بنیادی شکایت دور ہو سکتی ہے۔

پاکستان کی ہر حکومت بیرونی سرمایہ کاری کی منتظر رہتی ہے۔ موجودہ حکومت نے اپنے سابقہ تین سالہ دور میں بیرونی ملکوں میں درجنوں سرمایہ کاری کانفرنسیں کیں، اب بھی ''قرض اتارو، ملک سنوارو'' سکیم کے لئے تارکین وطن سے رجوع کیا گیا۔ ہمارے بھائیوں نے ہمیں کبھی مایوس

بیرون وطن پاکستانیوں کو ایک عدالتی فیصلے پر ووٹ کا حق دینے کی سکیم کی تیاری ہو رہی ہے

لیکن ہمارے اوورسیز بھائی کہتے ہیں کہ ووٹ کا حق ملنے کے بعد ان میں مزید انتشار پیدا ہوگا۔ پاکستانی سیاست اور فرقہ بازوں سے وہ پہلے ہی نالاں ہیں۔ علاقائی تعصبات بھی اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں اپنا تشخص قائم رکھنے کے لئے اب ایک ہی تجویز زیر غور ہے کہ

پاکستانی سیاست کو خیر باد کہہ دیا جائے اور جس ملک میں وہ رہتے ہیں وہیں کی سیاست میں حصہ لیں تو یہ ان کی آنے والی نسلوں کی ''صحت'' کے لئے بہتر ہوگا۔ برطانیہ میں بلدیاتی اداروں کی حد تک پاکستانیوں کو بے حد کامیابی ملی ہے۔ اس وقت ڈیڑھ سو کے قریب کونسلر ہیں اور کئی شہروں کی میئر شپ بھی پاکستانیوں کے پاس ہے یا ماضی میں رہی ہے۔ پارلیمنٹ میں پہلی بار ایک سیٹ ملی ہے اور چودھری محمد سرور کو بیرون وطن پہلے پاکستانی ایم پی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اگر برطانیہ میں مقیم پاکستانی ملکی سیاسی جماعتوں سے ''پرہیز'' کر سکیں اور ٹوری یا لیبر کے پلیٹ فارم پر متحرک اور سرگرم ہوں تو انہیں برطانوی پارلیمنٹ میں یہودیوں اور انڈین کے مقابلے میں زیادہ نشستیں مل سکتی ہیں۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی لائق داد ہیں کہ انہوں نے ملک کی ہر آڑے وقت میں مدد کی اور پاکستان دشمن اور بھارت نواز امریکی ارکان پارلیمنٹ کو شکست سے دوچار کرنے کے لئے کامیاب لابی مہم چلائی۔ نیویارک اور واشنگٹن کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی حب الوطنی کو سلام اور امریکہ کی ڈاکٹر ایسوسی ایشن کا کردار بھی ملّی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ شکاگو میں چودھری رشید جس خاموشی سے خدمت وطن میں مصروف ہیں اس پر ان کو دعا دینے کو جی چاہتا ہے کہ خدا ان کی توانائیوں میں ہمیشہ اضافہ کرے۔ تارکین وطن کی محفلوں میں بیٹھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ بھائی مذہبی تفرقہ بازی سے کس قدر تنگ اور عاجز ہیں۔ ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک کتاب کو ماننے والے باہم دست و گریباں ہیں۔ مساجد کو تالے لگانے کی نوبت آ جاتی ہے۔ امن عامہ کو کنٹرول کرنے کے لئے غیر مسلم پولیس کتوں سمیت خانہ خدا میں گھس جاتی ہے۔ اگر ہمارے علمائے دین اور مذہبی جماعتوں کی قیادت ذمہ داری کا مظاہرہ کرے تو تارکین وطن کم از کم جگ ہنسائی سے بچ سکتے ہیں۔ وطن عزیز میں تصادم بھی ختم ہونا چاہئے اور اندرونی اتحاد ہی بیرون وطن اتحاد کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ بیرون وطن پیدا ہونے والی تیسری نسل کے لئے ایسے علمائے دین، آئمہ مساجد اور خطیب صاحبان کی ضرورت ہے جو انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور دیگر زبانوں میں بچوں کو دینی تعلیم دے سکیں۔ ہمارے دینی مدارس کے چلانے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہاں ایسے

علماء تیار کریں جو بیرون ملک جا کر بدیسی زبانوں میں اپنے ماضی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔

اوورسیز پاکستانیوں کے ساتھ جو بدسلوکی ہمارے ائرپورٹوں پر ہوتی ہے اس پر ہمارے سرکاری اداروں کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے۔ پی آئی اے، امیگریشن، کسٹم اور اے ایس ایف اپنی اپنی استطاعت اور حرص کے مطابق آنے والے مہمانوں کو تنگ کرتے ہیں۔ درآمدات اور برآمدات کا محکمہ ان میں پہلے نمبر کا مستحق ہے۔ لاہور کے نور شاہ فاؤنڈیشن کے خیراتی مقاصد کے لئے لندن سے فیاض شاہ نے کروڑوں روپے کے کمپیوٹر کے آلات بھیجے جو کراچی کی بندرگاہ پر خرد برد کر لئے گئے۔ اس طرح کے المیے سے ہر تیسرے پاکستانی کو سابقہ پیش آتا ہے اور اگر ہمارے سرکاری اداروں نے اپنے طرز عمل کو بہتر نہ بنایا جن میں ہمارے بیرونی سفارت خانے بھی شامل ہیں تو تارکین وطن ہم سے بدک جائیں گے اور آئندہ کسی اوورسیز کنونشن میں ان کو مدعو کرنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں رہے گا۔

اس گریبان میں جھانکیں

موجودہ حکومت کا سب سے بڑا دعویٰ افتخار یہ ہے کہ اس نے کشکول توڑ دیا ہے اور ملک کو خود انحصاری، خود کفالت اور اپنے وسائل پر گزارہ کرنے کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ یہ نعرہ سابقہ دور میں شدومد کے ساتھ لگایا گیا اور اسی نعرے کو 97ء میں انتخابات جیتنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس مرتبہ خود انحصاری، خود کفالت اور اپنے وسائل پر گزارہ کرنے کی گردان سے تو اجتناب برتا جا رہا ہے۔ تاہم دریوزہ گری اور عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کی پالیسی کا اعلان کیا اور متبادل وسائل کی تلاش کے لئے ''قرض اتارو، ملک سنوارو'' کا نعرہ سامنے لایا گیا۔ پاکستانی قوم نے حسب استطاعت اپنا اپنا حصہ ڈالا لیکن جب دیکھا کہ حکمران تو ''قرض اتارو'' کا مطلب ''پرانا قرض اتارو اور نیا قرض حاصل کرو'' لے رہے ہیں اور آئی ایم ایف سے مل جانے والی ایک قسط پر اترایا جا رہا ہے کہ پاکستان نادہندگی اور دیوالیہ پن سے بچ گیا ہے اور اس کا مزید مطلب یہ لیا گیا کہ ملک اکنامک مینجرز کے محفوظ ہاتھوں میں ہے، اس سے ''قرض اتارو ملک سنوارو'' سکیم کو بریک لگ گئی اور اب سیدھے سیدھے بیرونی سرمایہ کاری کی اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ اس کے لئے اسلام آباد میں اوورسیز پاکستانیوں کو مدعو کر کے ایک کنونشن کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، بیرون وطن پاکستانی اعلانات اور بیانات کی حد تک

حکومت کو ضرور خوش کر رہے ہیں کہ وہ ہر قسم کی سرمایہ کاری کے لئے تیار ہیں لیکن عملاً پیش رفت دکھائی نہیں دیتی اور نہ مستقبل میں ایسی کوئی امید کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ جو اوورسیز پاکستانی ذاتی یا اجتماعی سطح پر وطن واپس آ کر یا بیرون وطن بیٹھے یہاں سرمایہ کاری کرتے ہیں، ان کا تجربہ ہوش ربا ہے۔ اگر چند سو پاکستانیوں (لاکھوں نہیں) کے تلخ تجربات کو ہی مرتب کیا جائے تو نئی طلسم ہوش ربا لکھی جاسکتی ہے اور اپنی تلخیوں کی وجہ سے اب تارکین وطن تمام تر خواہش اور ہر طرح کی ترغیب کے باوجود ملک کے اندر ایک دمڑی کی سرمایہ کاری کا خیال بھی ذہن میں نہیں لاتے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ پاکستان میں فالتو سرمایہ تو باہر بھاگ رہا ہے اور اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ بینکوں کو لوٹ کر اور رشوت کا بازار گرم کر کے اس ''گاڑھے خون پسینے کی کمائی'' کو یا تو بیرونی بینکوں کے محفوظ کھاتوں میں منتقل کر دیا گیا ہے یا دوبئی، کوریا، جرمنی اور دیگر من پسند ملکوں میں جا کر کارخانے لگا لئے جاتے ہیں۔ اگر ملک کے اندر رہنے والے اپنا فالتو سرمایہ ملک کے اندر لگانے کو تیار نہیں ہیں تو بیرون وطن پاکستانیوں کو ترغیب دینے کی کوشش کیسے پروان چڑھ سکتی ہے۔ تیسری بڑی رکاوٹ ماضی کے ذاتی تلخ تجربے ہیں اور تارکین وطن دوبارہ ایک سوراخ سے اپنے آپ کو ڈسوانے کے لئے تیار نہیں۔

میں نے اوورسیز کنونشن کے موقع پر اجمالی طور پر پاکستانی بھائیوں کی مشکلات کا ذکر کیا تھا جو انہیں وطن آ کر سرمایہ کاری کے سلسلے میں درپیش ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی بیرون وطن آباد بھائی اپنے لئے کوئی گھروندا بھی تعمیر کر لے تو اس کے باقی بھائی بند اس کی یہ کہہ کر چھٹی کرا دیتے ہیں کہ ''تمہارا یہاں کیا کام □! تمہارے بچے اس ماحول میں نہیں رہ سکتے''..... اس دلیل کے تحت بے چارے کے مکان پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے سابقہ کالم میں نور شاہ فاؤنڈیشن کے سربراہ سید فیاض حسین شاہ کے ایک ایسے ہی مسئلے کا ذکر کیا تھا کہ انہوں نے لاہور کے انتہائی پسماندہ علاقے میں تعلیمی ترقی کا ایک منصوبہ سوچا۔ اس کے تمام خدوخال جدید تصورات کے مطابق وضع کئے گئے تھے۔ یہ کہ وسیع و عریض جگہ پر کشادہ عمارت ہو، اس مقصد کے لئے زمین بھی خرید لی گئی۔ اس عمارت کو ایسے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مختص کیا جائے جنہیں پاؤں میں جوتا بھی نصیب نہیں ہوتا، پہلی جماعت سے ان کے سامنے کمپیوٹر رکھے جائیں تاکہ وہ آنے والی صدی کے تقاضوں کی تکمیل کے قابل ہو سکیں۔ فیاض شاہ نے حکومت پاکستان کو باقاعدہ خط لکھ کر اپنا عندیہ ظاہر کیا کہ وہ ذاتی کاوشوں سے دس ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کریں گے۔ وزارت تعلیم سے درخواست کی کہ سکول کے لئے جو کمپیوٹر باہر سے بھیجے جائیں، ان پر خصوصی رعایت کے تحت ڈیوٹی نہ لی جائے۔ وزارت تعلیم نے اس نیک مقصد کی تائید کی لیکن سی بی آر کے کسی ہونہار افسر نے ترت جواب دیا کہ کمپیوٹر کی درآمد پر پہلے ہی ڈیوٹی میں بہت کمی کی جا چکی ہے اور

دس فیصد کم از کم ڈیوٹی ادا کرنا ہوگی۔ فیاض شاہ نے ہار نہ مانی اور اپنی قوم کی تعلیمی پسماندگی کے خاتمے کے لئے □20 مئی 1994ء کو کمپیوٹروں سے بھرے ہوئے دو کنٹینر لاہور کے لئے بک کرا دیئے۔ ان کنٹینروں کا انتظار آج بھی ہو رہا ہے۔ لاہور ڈرائی پورٹ سے کوئی جواب نہیں ملتا کہ یہ کنٹینر کہاں گئے۔ آج تک سید فیاض حسین شاہ کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کی طرف سے ایک ہی چٹھی موصول ہوئی ہے اور یہ کسی ''قیامت نامے'' سے کم نہیں ہے۔ 24 مئی 95ء کو کے پی ٹی کے ڈپٹی ٹریفک منیجر (ویسٹ) کے دستخطوں سے نور شاہ ویلفیئر فاؤنڈیشن کو لکھی گئی اس چٹھی میں یہ ''خوش خبری'' سنائی گئی ہے کہ □22 نومبر 94ء کو ایک کارگو بحری جہاز سے جو دو کنٹینر بھیجے گئے ان کو چھڑانے کے لئے کے پی ٹی سے کسی نے رجوع نہیں کیا۔ (واضح رہے مال لاہور ڈرائی پورٹ کے لئے بک کیا گیا تھا) اس لئے کنٹینروں کو کھول لیا گیا ہے اور ان سے درج ذیل سامان ملا ہے۔ ایک سوٹ کیس اور ایک وی سی آر..... ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے..... □! کیا یہ تفصیل پڑھ کر آپ کا اتنا بھی دل نہیں کرتا کہ کسی دیوار سے ٹکر مار لیں۔ کمپیوٹروں سے بھرے ہوئے دو کنٹینر محض ایک سوٹ کیس اور ایک وی سی آر تک کیسے سکڑ گئے۔ ایوب خان کے دور میں سونے سے بھرا ہوتہہ خانہ اور سونے سے لدا ہوا جہاز پکڑے گئے تھے۔ جب حکام نے مزید خورد بینی مشاہدہ کیا تو سب کچھ پیتل میں بدل چکا تھا۔ بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور دیگر چیک پوسٹوں پر ہاتھ کی صفائی دکھانے والوں کی کوئی کمی نہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو درحقیقت ملک دشمنی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اس قدر اعصاب شکن گہرا زخم کھانے کے باوجود سید فیاض حسین شاہ نے ہار نہ مانی اور لاہور میونسپل کارپوریشن کو خط لکھ کر یہ اجازت طلب کی کہ کارپوریشن اپنے سکولوں میں کمپیوٹر سنٹرز نجی شعبے کی براہ راست نگرانی میں سکولوں کے زیر تعلیم طلبہ کو کمپیوٹر کی تعلیم دیں لیکن لاہور کارپوریشن نے گھڑا گھڑایا، رٹا رٹایا، سالوں پرانا جواب دیا کہ کارپوریشن اپنے سکولوں کو نجی مصرف میں لانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ کمپیوٹر تحفے میں دے دیئے جائیں اور کارپوریشن خود اپنی نگرانی میں یہ کمپیوٹر سکولوں میں رکھوا دے گی۔ جس کارپوریشن میں سرکاری خاکروب بھی ''صاحب'' کی کوٹھی پر ڈیوٹی دیتے ہوں، وہاں کمپیوٹرز کا حشر سوچنے کے لئے زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں۔

اخبارات میں چھپا کہ حکومت نے لاہور ہائیکورٹ کو کمپیوٹرائزڈ کرنے کے لئے وسائل دینے سے معذرت کی ہے۔ اب سید فیاض حسین شاہ چاروں طرف سے ہارنے کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ اگر لاہور ہائیکورٹ کی انتظامیہ ان کو اجازت دے تو وہ مطلوبہ کمپیوٹر تحفتاً برطانیہ سے بھجوا سکتے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب بھاری بھرکم

سود در سود قرضے حاصل کرنے کے لئے جتن کئے جا رہے ہوں اور پوری قوم کی غلامی کی قیمت بھی ادا کی جا رہی ہو، سید فیاض حسین شاہ کی یکے بعد دیگرے پیشکشوں سے فائدہ نہ اٹھانا کفران نعمت سے کم نہیں۔ ایک فیاض حسین شاہ پر موقوف نہیں، کئی لوگ تعمیر وطن کے لئے فنڈنگ کرنے کو تیار ہیں۔ ''لور پول'' کے ایک دردمند دل رکھنے والے ڈاکٹر پاکستان میں معذور بچوں کے لئے رہائشی سکول کھولنے کے متمنی ہیں۔ وہ بھی ایک ادارے کے ہاتھوں اپنی تمناؤں کا خون کروا چکے ہیں جس نے معذوروں کے لئے بنی بلڈنگ پر قبضہ کر کے اس میں اپنا بزنس کا دفتر کھول لیا ہے۔ بتایئے اس ماحول میں ہمارے بیرون وطن بھائی کیا کردار ادا کر سکیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ شیخ رشید صاحب کو بیرونی سرمایہ کاری سے کس قدر دلچسپی ہے۔ میں نے اس کا مشاہدہ اپنے بیرون وطن طویل قیام کے دوران اچھی طرح کیا ہے۔ ایڈنبرا میں جہاں سکاٹ لینڈ کے پاکستانیوں کا ایک اجتماع تھا، شیخ صاحب نے اپنا پیغام کس حد تک پہنچایا، اس سے خود شیخ صاحب زیادہ آگاہ ہیں۔ ایڈنبرا سے وہ مانچسٹر چلے آئے اور انہوں نے اس شہر کے پاکستانیوں میں سے کس کس سے ملاقات کی، اس سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہیں۔ میں تنقید اور تنقیص کا قائل نہیں، شیخ صاحب آئین پاکستان کے تحت عائد ہونے والی پابندیوں کے تحت اس امر کے مکلف ہیں کہ وہ اپنی وزارت کے منصبی تقاضوں کی تکمیل کریں اور بیرون وطن نظر آنے والے رابطے قائم کریں اور جن تارکین وطن بھائیوں کو اب تک جو دکھ پہنچے ہیں، ان کا مداوا کریں۔ کم از کم کراچی پورٹ ٹرسٹ سے یہ معلوم کرنے میں تو کامیاب ہوں کہ آخر خیراتی مقاصد کے تحت آنے والے کمپیوٹروں سے لدے پھندے دو کنٹینر کہاں غائب ہو گئے؟

ہمیں بدنظمی پر مبنی اس نظام کو بدلنا ہے جس کے انگ انگ میں لوٹ مار، کرپشن اور بدعنوانی کا سرطان سرایت کر چکا ہے۔ حالات کو جوں کا توں رکھ کر ہم آگے بڑھنے کی سکت سے محروم ہو سکتے ہیں۔